جس بزم کے ہیں ہم تخت نشیں، وہ بزم ہے بزم عرفانی
اس بزم کی ہے ہر صبح حسیں، ہر شام ہے اس کی نورانی
یہ بزم ہے ان شاہینوں کی، فطرت میں ہے جن کی سلطانی
یہ قلب ونظر کی دنیا ہے، ہر نقش ہے اس کا لافانی

ندوۃ العلماء میں کشمیری طلبہ کا دینی، علمی، ادبی وثقافتی ترجمان

سال نامہ شاہِ ہمدان ۲۰۲۵-۲۶ء

خصوصی شمارہ

شاہِ ہمدان

نظمائے ندوہ - حیات وخدمات

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

مدیر
محمد انیس الرحمٰن

معاون مدیر
طلحہ نذیر ندوی

مجلس مشاورت
شمشاد احمد خان — جہانگیر فیاض — مشتاق احمد ڈار — محمد حسان میر

شائع کردہ: جمعیۃ طلاب جموں وکشمیر دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

تزئین: عبدالرحیم ندوی 8726305094

فہرست

نمبر شمار	عناوین	مضمون نگار	صفحہ نمبر
1	اداریہ	ایڈیٹر کے قلم سے	4
2	پیغام	حضرت ناظم صاحب	5
3	کلمات تہنیت	جمعیت ابنائے ندوہ جموں و کشمیر	6
4	تحریک ندوۃ العلماء اور اس کا تاریخی پس منظر	محمد انیس الرحمٰن	7

فصل اول (نظمائے ندوہ کے سوانحی خاکے)

1	مولانا سید محمد علی مونگیری - سوانحی خاکہ	شیخ محمد کامران	12
2	مولانا مسیح الزماں خان - سوانحی خاکہ	بلال احمد	14
3	مولانا خلیل الرحمن سہارنپوری - سوانحی خاکہ	یاسر عرفات	16
4	حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کا سوانحی خاکہ	وسیم یوسف	17
5	مولانا سید نواب علی حسن خان - سوانحی خاکہ	پیر مبشر منظور	20
6	مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی - حالات زندگی	محمد زاہد	22
7	مفکر اسلام کا مختصر سوانحی خاکہ	شہباز بشیر شاہ	24
8	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	طلحہ نذیر ندوی	26
9	مولانا سید بلال عبدالحی حسنی	عمر رشید	28

فصل ثانی (نظمائے ندوہ بہ حیثیت ناظم)

1	مولانا مونگیری اور ندوۃ العلماء	عزیز الرحمن	31
2	مولانا مسیح الزماں خان بہ حیثیت ناظم	مشتاق احمد ڈار	34
3	مولانا خلیل الرحمن سہارنپوری کا دور نظامت	سجاد حسین	37
4	مولانا سید عبدالحی حسنی کا دور نظامت	مبرور ہلال	38
5	مولانا سید نواب علی حسن خان کا دور نظامت	عبدالوحید پالہ	40

6	مولانا ڈاکٹر ڈاکٹر سید عبدالعلی بہ حیثیت ناظم	شکیل احمد بٹ	42
7	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی بہ حیثیت ناظم	اسحاق احمد	45
8	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا دورِ نظامت	وسیم اکرم	48
9	مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ کا دورِ نظامت	محمد انیس الرحمٰن	51

فصل ثالث (نظمائے ندوہ کی علمی، دینی خدمات)

1	مولانا مونگیریؒ کا ردِ قادیانیت وعیسائیت	محمد حسان میر	58
2	مولانا مونگیری اور احسان وسلوک	رضوان منظور	62
3	علامہ حکیم سید عبدالحی حسنی کی علمی خدمات	طلحہ نذیر ندوی	66
4	علامہ سید عبدالحی حسنی ایک معتدل مورخ "نزهة الخواطر" کے آئینہ میں	عرفات احمد	69
5	مولانا نواب سید علی حسن خان کی کتابوں کا مختصر تعارف	طلحہ نذیر ندوی	74
6	مولانا سید عبدالعلی اور ندوۃ العلماء	ضیاء الحسن خان	76
7	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی دعوتی خدمات	عابر عباس	79
8	مولانا علی میاں اور عالم عرب	جہانگیر فیاض	84
9	مولانا علی میاں ندوی کا تنظیموں واداروں کی سربراہی اور شخصیات سے تعلق	مدثر آخون	88
10	مولانا میاں ندوی کی اہم تصنیفات اور ان کا مختصر تعارف	ندیم حسین بیگ	92
11	مولانا علی میاں اور اہل کشمیر کے باہمی تعلقات وکشمیر کے اسفار	عتیق الرحمن نعمانی	96
12	مرشد الامت بہ حیثیت ادیب ومفکر	مدثر بشیر کشمیری	100
13	مرشد الامت کی اہم تصنیفات کا مختصر تعارف	عمر جان	104
14	مرشد الامت - ایک بے مثال معلم، ایک رجال ساز استاد	مصدق سعید	108
15	مولانا سید بلال عبدالحی حسنی مدظلہ کی علمی وملی خدمات	اویس احمد	111
16	جمعیۃ طلاب جموں وکشمیر تعارف وسرگرمیاں	طلحہ نذیر ندوی و محمد انیس الرحمٰن	114
17	فہرست نظمائے جمعیت طلاب جموں وکشمیر		118
18	فہرست معاونینِ ناظم وارا کین		118
19	امسال فارغ ہونے والے سندی درجات کے طلبہ کی فہرست		119

اداریہ

ایڈیٹر کے قلم سے

زیرِ نظر سالنامہ مجلہ قارئینِ علم و دانش کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے دل شکر سے معمور اور نگاہیں امید سے لبریز ہیں۔
یہ شمارہ ایک ایسے موضوع کو سامنے لے کر آرہا ہے جو نہ صرف ندوۃ العلماء کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے بل کہ اس کے انتظامی اور ارتقائی تسلسل کا آئینہ دار بھی ہے۔

سالنامہ کا عنوان "نظمائے ندوہ کی حیات و خدمات" دراصل کاروانِ ندوہ کے ان قائدین کی یاد تازہ کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے جنھوں نے مختلف ادوار میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی نظامت کی ذمہ داری سنبھالی اور اپنی قائدانہ بصیرت اور اخلاص وحکمت سے اس ادارے کو استحکام بخشا اور اسے ارتقائی منازل طے کراتے ہوئے بامِ عروج تک پہنچایا۔ ان حضرات کی حیات وخدمات محض انتظامی تاریخ نہیں بل کہ ایک ایسے قائدانہ سفر کی داستان ہے جس میں قدیم صالح وجدید نافع کی روح، اور روایت و جدت کی ہم آہنگی نمایاں طور پر جلوہ گر نظر آتی ہے۔

اس سالنامہ کی ایک نمایاں اور قابلِ توجہ خصوصیت یہ ہے کہ اسے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں زیرِ تعلیم جموں وکشمیر کے طلبہ نے اپنے تحقیقی ذوق، علمی وابستگی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ان طلبہ نے اس کام کو محض ایک اشاعتی سرگرمی نہیں سمجھا بل کہ تحقیق وترتیب کے مختلف مراحل سے گزار کر اسے ایک منظم اور معتبر دستاویز کی صورت میں قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

عناوین کے انتخاب سے لے کر مجلّے کی اشاعت تک برادرم طلحہ نذیر ندوی کا بھرپور تعاون رہا۔ ان عناوین پر استادِ محترم حضرت مولانا فیصل احمد بھٹکلی صاحب مدظلہ کی حتمی نظر اور متعدد اہم اضافے شامل رہے۔ اسی طرح حضرت ناظم صاحب دامت برکاتہم نے اول وقت سے سرپرستی فرمائی جو اس شمارے کے علمی وتحقیقی وقار کی ضمانت کے لیے کافی ہے۔ حضرت الاستاد اور حضرت ناظم صاحب کی رہنمائی و سرپرستی کے بغیر ایسا تحقیقی کام ممکن نہ تھا۔ اس لیے ہم سب ان دونوں حضرات کا تہ دل سے شکرگزار ہیں۔ فجزاكما الله خيرا الجزاء.

امید ہے کہ یہ سالنامہ نہ صرف ندوی برادری کے لیے ایک قیمتی دستاویز ثابت ہوگا بل کہ تاریخِ ندوہ، تعلیمی قیادت اور ادارہ جاتی فکر سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے بھی ایک معتبر ماخذ کی حیثیت اختیار کرے گا۔

اگر یہ کاوش نئی نسل کے اندر اداروں کی قدر شناسی اور قیادت کے ذمہ دارانہ شعور کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ ندوہ کی تاریخ سے شناسائی پیدا کرنے میں بھی کامیاب ہوجائے تو ہم اسے اپنی محنت کی بڑی کامیابی سمجھیں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس سعی ناچیز کو قبول فرمائے اور مادرِ علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء کو ہمیشہ ایسے ہی باصلاحیت، مخلص اور صاحبِ بصیرت رہنما عطا فرماتا رہے۔ آمین!

دعاؤں کا طالب

محمد انیس الرحمٰن

ناظم جمعیۃ طلاب جموں وکشمیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi

Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.)

بلال عبد الحي الحسني الندوي

دارِعرفات، دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

Ref:......................

Dated:..................

پیغام

اللہ تبارک وتعالیٰ نے وادی کشمیر کو غیر معمولی صفات اور خصوصیات سے نوازا ہے، ''کشمیر جنت نظیر'' مثل مشہور ہے، تاہم وہاں کے پڑھے لکھے لوگوں میں دینی جذبہ اور فکرمندی بھی ایک اچھی چیز ہے، ندوۃ العلماء سے کشمیر کا تعلق بہت قدیم ہے، آزادی سے قبل ۱۹۴۵ء میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا پہلا سفر کشمیر ہوا، پھر ۱۹۸۱ء میں حضرت مولانا کا باضابطہ ایک تاریخی دورہ ہوا جو ہر لحاظ سے انتہائی مفید اور نفع بخش ثابت ہوا، اس کے بعد ندوہ کی امتیازی فکر اور اس کی صدا وادی کشمیر میں کوئی اجنبی اور نامانوس بات نہ تھی بلکہ اس کی پذیرائی اور قبولیت کا یہ اثر دیکھنے میں آیا کہ وہاں کے طلبہ جوق درجوق ہر سال ندوۃ العلماء میں حصول علم کے لیے حاضر ہونے لگے، یہاں تک کہ موجودہ وقت میں ان کی ایک بڑی تعداد ندوہ میں زیرِ تعلیم ہے اور ایک بڑی تعداد ان حضرات کی بھی ہے جو ندوہ سے سند فضیلت حاصل کر چکے ہیں۔ امید ہے کہ یہ نسل اپنے علم وفکر اور اخلاق وکردار کے ذریعہ سے وہاں کے حالات پر اثر انداز ہوگی۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ندوہ میں زیرِ تعلیم کشمیر کے طلبہ نے ''جمعیت طلابِ جموں وکشمیر'' کے نام سے اپنی ایک انجمن بھی قائم کی ہے جس کے تحت وہ اپنے صوبائی طلبہ کے باہمی تعاون کی مختلف شکلوں پر عمل کرتے ہیں، ایک دوسرے کے علمی سفر کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں، مالی کمزوریوں پر خصوصی نظر رکھتے ہیں اور مختلف مناسبتوں سے تربیتی مجالس کے انعقاد کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ زبان وبیان پر عبور حاصل کرنے کے لیے تقریری وتحریری صلاحیتوں کو پختہ کرنے کی مشق بھی کرتے ہیں اور خاص طور پر عربی، اردو وانگریزی زبان میں صحافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔

مبارک باد کے مستحق ہیں کشمیر کے وہ طلبہ جنھوں نے سال رواں اپنی صوبائی انجمن کے تحت ''سال نامہ شاہِ ہمدان'' کے نام سے نظمائے ندوۃ العلماء پر ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا، بلاشبہ یہ مجلّہ اپنی حسن ترتیب اور زبان وبیان کے لحاظ سے بہت اہم ہے، اس میں سب سے پہلے بالترتیب تمام نظمائے ندوۃ العلماء کے حالات زندگی پر سلیس اور رواں اسلوب میں مضامین شامل اشاعت ہیں، پھر ان کے دورِ نظامت پر مفصل مضامین ہیں اور اخیر میں ان کی علمی ودینی خدمات کا ایک جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے، اس طرح اس اشاعت کی اہمیت ومعنویت دوچند ہوجاتی ہے۔ میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان طلبہ کو جزائے خیر دے، اس اشاعت کو قبول فرمائے اور انھیں جہد مسلسل اور سعی پیہم کی توفیق سے نوازے۔ آمین!

بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ❁ جنرل سیکریٹری آل انڈیا پیام انسانیت فورم ❁ سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

Website: www.abulhasanalinadwi.org ❁ Mobile: 8543941411 ❁ E-Mail: bilal.hasani.nadwi@gmail.com

کلمات تہنیت

لائقِ صد آفریں ہیں دار العلوم ندوۃ العلماء میں زیرِ تعلیم طلبۂ جموں وکشمیر، جو مسلسل چند سالوں سے اپنی درسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ایک سالانہ مجلہ تیار کر رہے ہیں۔ طلبہ کی مضمون نگاری میں یہ جدوجہد اور دل چسپی ان کے روشن مستقبل اور تعلیم وتعلّم میں ان کی سنجیدگی کو ظاہر کرتی ہے۔

کشمیر کی سرزمین ہمیشہ سے زرخیز اور مردم خیز واقع ہوئی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اپنے اوقات اور اپنی صلاحیتوں کو صحیح مصرف میں استعمال کیا جائے۔

امسال مجلہ کے عنوان کا انتخاب لائقِ تحسین ہے۔ اس کے ذریعے قدیم طلبہ کو تاریخ ندوۃ العلماء کے مطالعے کا نہ صرف بآسانی موقع میسر ہوگا، بلکہ تاسیس ندوہ کے مقاصد واہداف بھی ذہن میں تازہ رہیں گے۔

جمعیت ابنائے ندوہ جموں وکشمیر اپنے ان لائق فضلاء سے یہ امید وابستہ رکھتی ہے کہ وہ آئندہ بھی مضمون نگاری کی اس صنف کی طرف قابلِ ذکر توجہ مرکوز رکھ کر اپنی تحریروں میں سلاست وروانی اور قوت ومضبوطی پیدا کریں گے۔

''نظمائے ندوہ: حیات وخدمات'' کے عنوان سے مزین اس خصوصی شمارے کی رسم رونمائی کے موقع پر جمعیت اپنے ان جدید فضلا کو ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہوئے دست بہ دعا ہے کہ اللہ آپ کی ان کاوشوں کو قبول فرمائے اور انہیں نافع بنائے۔ آمین!

صدر جمعیت ابنائے ندوہ
جموں وکشمیر

JAM'IYYATU ABNAA_EN_NADWA
جمعية أبناء الندوة
جامو وكشمير
(Nadwa Alumni Association) J&K

تحریکِ ندوۃ العلماء اور اس کا تاریخی پس منظر

محمد انیس الرحمٰن

عالیہ رابعہ شریعہ

چودہویں صدی ہجری کا طلوع اور اُنیسویں صدی کا آخری عہد عالمِ اسلام کی تاریخ میں ایک ایسے مرحلے کے طور پر آیا جس میں امت فکری انتشار، ذہنی پژمردگی اور باہمی تناؤ کی گھاٹیوں میں اترتی چلی جارہی تھی۔ نئے عالمی حوادث اور تمدنی چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی توانائی اہلِ علم سے رخصت سی ہو رہی تھی، اور مسلم معاشرہ دو الگ الگ متضاد طبقات میں منقسم ہو کر بالکل اجنبی سانچوں میں ڈھلتا جارہا تھا۔ ایک طرف قدیم مدارس کے تربیت یافتہ علماء تھے جو صدیوں کی روایات کے امین تھے؛ اور دوسری طرف مغربی طرزِ تعلیم والی یونیورسٹیوں کے فیض یافتہ افراد تھے جن کا ذہنی وتہذیبی رخ مکمل طور پر مختلف ہو چکا تھا۔ ان دونوں کے درمیان بے گانگی کی خلیج یوں وسعت پکڑ چکی تھی کہ گویا ایک زبان بولنے والوں میں بھی مفاہمت کے دروازے بند ہو رہے تھے، اور اندیشہ تھا کہ کوئی ترجمان ہی اس فاصلے کو پاٹ سکے۔ صرف یہی نہیں، مذہبی گروہوں اور فقہی مسالک کے درمیان بھی تحقیر، بدگمانی اور نفرت انگیزی کی تیز لہر چل رہی تھی۔ فروعی مسائل پر مناظروں کے بازار گرم تھے، جو کبھی کبھی اثبات و تردید کی حدوں سے آگے بڑھ کر تفسیق و تکفیر کے نازک مرحلوں تک جا پہنچتے۔ دینی مدارس کا نصاب جامد و منجمد سمجھا جاتا تھا، جہاں ترمیم و تبدیلی کا خیال بھی بدعت تصور ہوتا۔ علمی دنیا پر جمود و سکوت کے سائے تھے، اور جدید علوم وفنون کے دروازے بند ہوتے چلے جارہے تھے۔ وقت کی برق رفتاری اور معاشرتی تغیر کا باب تبھی کھلتا جب علماء سیاست کی راہ پر قدم رکھتے، مگر مجموعی طور پر امت فکری یلغار کے سامنے تنہا اور غیر محفوظ کھڑی تھی۔

ایسے نازک دور میں ۱۸۹۲ء میں مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی روشن دماغی اور غیر معمولی بصیرت نے مسلمانوں کے اجتماعی مستقبل کے لیے نئی راہ نکالی۔ مدرسہ فیضِ عام کانپور کی ایک سالانہ تقریب میں ''انجمن ندوۃ العلماء'' کے قیام کی تجویز پیش ہوئی، اس موقع پر ہندوستان کے چوٹی کے مشاہیر علماء جمع تھے۔ اسی میں اس انجمن کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ آئندہ سال ندوۃ العلماء کے نام سے ایک جلسہ کیا جائے۔ مولانا محمد علی مونگیریؒ کو اس انجمن کا پہلا ناظم اور سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ مولاناؒ نے ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد سے تعارف کرانے کے لیے ملک کے کونے کونے میں اپنے آدمی بھیجے جنہوں نے علماء اور جدید حلقہ سے رابطہ قائم کر کے انہیں ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ اس طرح ۲۲، ۲۳، ۲۴ راپریل ۱۸۹۴ء کو اس کا پہلا تاریخی اجلاس مدرسہ فیض عام کانپور میں منعقد ہوا۔

یہ منظر تاریخ کے اوراق میں ایک نادر مثال کے طور پر ثبت ہے کہ پہلی مرتبہ علماء، جدید تعلیم یافتہ حضرات، اہلِ حدیث و احناف کے نمائندے، امراء و روساء اور ماہرینِ تعلیم ایک ہی صف میں شانہ بہ شانہ کھڑے نظر آئے۔ تو پھر ملک کے گوشے گوشے میں ایک کے بعد ایک اجلاس منعقد ہونے لگے۔ ہر طبقۂ

فکر کے مسلمانوں نے ندوۃ العلماء کے مقاصد ومنصوبوں کو خلوصِ دل سے سراہا اور اس تحریک کو زمانے کا ناگزیر تقاضا قرار دیا۔

وجہ تسمیہ

اس تحریک کا نام ''ندوۃ العلماء'' رکھا گیا، اس لیے کہ یہ دراصل اربابِ علم وفکر ہی کی دعوت، مشاورت اور دردِ دل کا ثمرہ تھی۔ اس کا نقطۂ آغاز مسلمانوں کے باہمی اتحاد، فکری رواداری اور علمی ہم آہنگی کا احیاء تھا۔ ۱۸۹۴ء سے شروع ہونے والا یہ کارواں مسلسل ترقی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ اس کے سالانہ اجلاس ملک کے بڑے بڑے مراکز میں نہایت شان ووقار سے منعقد ہوتے رہے اور اس کی آواز پورے ہندوستان میں گونجتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ میں ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' کی بنیاد رکھی گئی ایک ایسا ادارہ جو اعتدال واجتہاد، فکر وتحقیق، تہذیب وادب اور تربیت کا حسین امتزاج تھا۔

تحریک ندوۃ العلماء دیوبند اور علی گڑھ کی دو عظیم تحریکوں کے بعد وجود میں آئی۔ جب قدیم دینی علوم کی تحریک اور جدید مغربی تعلیم کی تحریک دونوں اپنی ربع صدی کے تجربات سے گزر چکی تھیں، تب تحریک ندوہ ایک ایسا پُل بن کر سامنے آیا جو ماضی اور حال، روایت اور تجدید، قدامت اور جدت کو ایک مرکز پر جمع کرنا چاہتا تھا۔

تحریک کے بنیادی اغراض ومقاصد

ابتدا میں اس تحریک کے دو مقاصد تھے۔ پھر مولانا مونگیری اور ان کے عالی ہمت رفقا کی قیادت میں جوں جوں آگے بڑھتی رہی، اس نے اپنے دائرہ کار اور بنیادی مقاصد میں اضافہ کیا۔ اب گویا مندرجہ ذیل چار مقاصد تحریک ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد قرار پائے۔

(۱) علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دور رس اور بنیادی اصلاحات اور ہر دور میں تمدنی حالات کے تقاضے کے مطابق نئے نصاب کی تیاری۔

(۲) رفع نزاع باہمی، اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

(۳) ایسے علماء پیدا کرنا جو کتاب وسنت کے وسیع وعمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں۔

(۴) اسلامی تعلیمات کی اشاعت بالخصوص برادر وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا، ان کے سامنے اس کی ہمہ گیری اور پوری انسانی برادری کے لیے باعثِ رحمت قرار دینا اور اسلام کے بارے میں ان کی وحشت کو دور کرنا۔

نئے نظامِ تعلیم کی تشکیل

تحریکِ ندوہ کے قائدین اور ان کے فرزندوں کا یقین تھا کہ خواہ کوئی نصاب کتنا ہی کامل اور صحت مند کیوں نہ ہو، وہ زندگی کے تمام مراحل کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ذہنی تربیت اور اضافی معلومات کے لیے ملک کی زبانوں میں ایسی کتابیں فراہم کی جائیں جو معاشرے کے ہر طبقے، ہر مزاج اور ہر ذہنی سطح کی علمی وفکری ضرورت پوری کر سکیں۔ پھر زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر ندوۃ العلماء کے فضلا نے ایک ایسا نصاب بھی مرتب کیا جو آغازِ تعلیم سے اعلیٰ درجات تک موجود مختلف ادبی ذوق اور فکری رجحانات کا احاطہ کرتا ہے اور نئی نسل کی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔

نصاب تعلیم کی اصلاح کے ساتھ ساتھ مختلف علوم و فنون مثلاً زبان وادب، نقد وتاریخ، جغرافیہ، اصولِ فقہ، اصولِ حدیث، فقہ، نحو وصرف، بلاغت اور فکرِ اسلامی پر مستند اور وقیع علمی وتحقیقی کتابوں کی تیاری ندوۃ العلماء کی توجہ کا ہمیشہ بنیادی مرکز رہی ہے۔ اس کے ساتھ اسلام دشمن اور گمراہ کن تحریکات سے وابستہ فکری چیلنجوں سے اہلِ علم وفکر کو باخبر کرنا بھی اس

تحریک کا ایک اہم مقصد تھا۔

ندوہ نے فکرِ اسلامی کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے، عقلی یلغاروں اور مستشرقین کے فریب کارانہ حملوں کا مؤثر جواب دینے اور تعلیم یافتہ طبقے کی ذہنی سطح بلند کرنے کے لیے ایک ہمہ گیر علمی و تصنیفی تحریک کی بنیاد رکھی۔ اسی مقصد کے لیے ہندوستانی زبانوں خصوصاً اردو میں ایک عظیم علمی سرمایہ تیار کیا گیا، جو اپنی وسعت، مقبولیت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے آج بھی رابطے کی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ندوہ کے تعلیمی منتظمین کی یہ کوشش ہمیشہ رہی کہ عرب دنیا اور اسلامی علمی روایت کے معیار کو ساتھ لے کر چلا جائے تاکہ ان کے فضلا علم وفکر کے عالمی قافلے سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ طلبہ کو وسیع علمی مآخذ ومصادر تک رسائی دی گئی، تاکہ وہ اپنے فکری افق کو وسعت دے سکیں، علمی تنوع پیدا کریں اور علم کے جاری سفر میں باوقار طریقے سے ساتھ چلتے رہیں۔ یہی احساس انہیں احساسِ کمتری سے بچاتا ہے اور علمی دنیا میں اعتماد اور عزت کا مقام عطا کرتا ہے۔

تحریک ندوۃ العلماء کی فکری اساس

ندوۃُ العلماء کی تحریک کی فکری بنیاد وہ زندہ تصور تھا جس نے اسے ملت کی فکری رہنمائی، علمی حفاظت اور زمانے کے بدلتے ہوئے چیلنجوں سے کامیاب مقابلے کی غیر معمولی صلاحیت عطا کی۔ یہ وہ امتیازی وصف تھا جس نے ندوہ کو محض ایک ادارہ نہیں بلکہ ایک فکر، ایک بصیرت اور ایک تعمیری تحریک بنا دیا، جو بدلتے وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر ملت کا ہاتھ تھام سکے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ''حیاتِ عبدالحی'' میں اس تحریک کی فکری بنیاد کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''(۱) اس تحریک کی اساس (علی گڑھ کی تعلیم جدید اور مغربی تہذیب کی دعوت اور ملک کی دوسری تحریکوں کے خلاف) خالص دینی تھی یعنی اس میں مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب دین سے انحراف اور صحیح دینی تعلیم سے محرومی کو قرار دیا گیا تھا اور اسی کو ملت کے درد کا مداوا اور اصلاح وترقی کا واحد راستہ تسلیم کیا گیا تھا۔

(۲) اس تحریک میں علماء طبقہ کو مرکزی مقام دیا گیا اور اسی کو امت کی تعمیر وتخریب ترقی وتنزل واصلاح وفساد کا اصل ذمہ دار قرار دے کر اپنی دعوت کا جدوجہد کا محور ومرکز بنایا گیا کہ امت میں اصلاح حال کی کوشش حقیقی طور پر اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک علماء اس کے داعی اور علمبردار نہ بنے۔ اور ان میں امت کی رہنمائی اور قیادت کی صلاحیت پیدا نہ ہو۔ اس کے لیے ایک طرف دینی علوم پر حاوی اور کتاب وسنت رمز شناس ہونے کی ضرورت ہے تو وہیں دوسری طرف حالات زمانہ اور جدید ضرورتوں سے واقفیت کی۔

(۳) ندوۃ العلماء کی تحریک کا آغاز ہی رفع نزاع باہمی اور اصلاح وترقی نصاب کے کام سے ہوا تھا۔

(۴) اس تحریک کا مزاج (سیاسی ہنگاموں کے بجائے) علمی وفکری تھا اور یہی ان کا اصل مزاج تھا۔

(۵) انگریزی زبان اور بقدر ضرورت جدید علوم کو نصاب میں داخل کیا جائے اور ان کو دینیات اور عربی علوم وفنون کے ساتھ پڑھایا جائے۔''

(تفصیل کے لیے دیکھیں: (حیات عبدالحی: ۱۵۱)

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام

۱۲ محرم ۱۳۱۳ھ کو شہرِ بریلی کے ایک تاریخی اجتماع میں حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے سب سے پہلے ایک ایسے عظیم علمی ادارے کے قیام کا تصور پیش کیا جو آگے چل کر ملت کی فکری و تعلیمی رہنمائی کا مرکز بننے والا تھا۔ اس مسودہ کا (دارالعلوم کا ابتدائی خاکہ) اہلِ علم ودانش کی آرا کے حصول کے لیے ملک کے ممتاز علماء

اور اہلِ فکر تک پہنچایا گیا۔ اگلے برس منعقد ہونے والے اجلاس میں طویل غور وخوض اور سنجیدہ مباحث کے بعد اس مسودے کو متفقہ طور پر منظور کرلیا گیا۔

اس مسودے کی دفعات نہایت جامع اور ہمہ گیر تھیں۔ ان میں درس و تدریس کے لیے باقاعدہ عمارت، طلبہ کے لیے دارالاقامے، عظیم الشان کتب خانہ، شفا خانہ، اساتذہ کی رہائش گاہیں، لیکچر ہال (محاضرہ گاہیں)، طلبہ کی نمائندہ انجمن اور مسجد کی تعمیر جیسے اہم اجزاء شامل تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ طلبہ کی اخلاقی و عملی تربیت کے نظام، ادارے کے اصول واقدار، ضوابط و شرائط، نیز تعلیم وتدریس کے منہج اور نصاب کی واضح تفصیلات بھی طے کی گئیں۔

علماء کرام نے نہ صرف اس مسودے کی بھرپور تائید کی بلکہ علماء کی سرپرستی میں قائم ہونے والے اس دارالعلوم کو ہندوستان ہی نہیں بل کہ پورے عالمِ اسلام کے لیے ایک انقلابی اور دوررس نتائج کا حامل قدم قرار دیا۔ اس موقع پر یہ تجویز بھی منظور کی گئی کہ عالمِ اسلام کے مختلف تعلیمی مراکز سے وقتاً فوقتاً نصاب کی تفصیلات حاصل کی جائیں، اور اگر کسی مطلوبہ کتاب کا معیار میسر نہ آئے تو اسے خود مرتب کیا جائے۔

بالآخر اس عظیم علمی منصوبے کے لیے لکھنؤ کا انتخاب عمل میں آیا، جو اپنی علمی، ادبی اور تہذیبی روایت کے اعتبار سے ہر طرح اس ادارے کے شایانِ شان تھا۔ چناں چہ ۱۶ رشوال ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۰ رمارچ ۱۸۹۰ء کو کانپور سے علماء کا ایک وفد حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی قیادت میں لکھنؤ پہنچا۔ منشی احترام علی کاکوروی اور منشی احتشام علی کاکوروی نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گومتی کے کنارے واقع اپنی وسیع اراضی ندوۃ العلماء کے نام وقف کردی۔ ابتدا میں گولا گنج کی ایک عمارت خرید کر عارضی طور پر دارالعلوم قائم کیا گیا، پھر بہ تدریج مستقل عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۲ ردسمبر ۱۸۹۸ء کو کانپور سے ندوۃ العلماء کا دفتر منتقل ہو کر لکھنؤ کے گولا گنج پہنچ گیا، اور ۲۶ رستمبر کو اس عمارت میں دارالعلوم کا باقاعدہ افتتاح عمل میں آیا جو اس مقصد کے لیے خریدی گئی تھی۔ (تاریخ ندوہ اول: ۲۱۰)

یوں دارالعلوم ندوۃ العلماء نے جس ولولہ، صادق اور بلند حوصلے کے ساتھ اپنے انقلابی سفر کا آغاز کیا تھا، اسے مسلسل آگے بڑھایا۔ ایک طرف ملک کے طول وعرض میں اس کے تعارف اور پیغام کے لیے سالانہ اجلاس نہایت اہتمام سے منعقد ہوتے رہے، تو دوسری جانب تعلیم وتربیت، دعوت وتبلیغ اور تصنیف و تالیف کے میدانوں میں بھی اس ادارے نے بھرپور خدمات انجام دیں۔ ان ہی مساعی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ندوۃ العلماء کو ایسی مخلص اور باکمال شخصیات عطا فرمائیں جنھوں نے نہ صرف اس کے پیغام کو مشرق سے مغرب تک عام کردیا بل کہ اس کے اثر سے ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی میں نمایاں کمی آئی اور قدیم وجدید کے مابین حائل فاصلہ بڑی حد تک ختم ہوگیا۔

☆☆☆

فصل اوّل

نظمائے ندوہ کے سوانحی خاکے

مولانا سید محمد علی مونگیریؒ-سوانحی خاکہ

شیخ محمد کامران
عالیہ ثالثہ شریعہ

حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ برصغیر کے ان ممتاز علماء و مصلحین میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کی دینی، تعلیمی اور فکری رہنمائی میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ ندوۃ العلماء کے بانیوں میں شامل اور اس کے پہلے ناظم تھے۔ آپ کی پوری زندگی دین کی خدمت، امت کی اصلاح اور باطل افکار کے رد میں گزری۔

ولادت اور نسب

مولانا سید مونگیری کی ولادت ۲۸/ جولائی ۱۸۴۶ء کو کانپور (اتر پردیش) میں ہوئی، جب کہ آپ کا اصل وطن مونگیر (بہار) تھا۔ آپ کا تعلق ایک معزز سادات خاندان سے تھا اور نسب کے اعتبار سے آپ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے جا ملتے ہیں۔ آپ کے اجداد علم و تصوف سے وابستہ رہے، جس کا اثر آپ کی شخصیت میں نمایاں نظر آتا ہے۔

ابتدائی تعلیم و تربیت

مولاناؒ نے کم سنی ہی میں والد کا سایہ کھو دیا، جس کے بعد آپ کی پرورش دادا اور چچا کی نگرانی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، بعد ازاں آپ نے مختلف مقامات پر جا کر دینی علوم حاصل کیے۔ کانپور، سہارنپور اور دیگر علمی مراکز میں آپ نے معقولات و منقولات کی تعلیم کی تکمیل کی۔ آپ کو حدیث، فقہ اور تفسیر سے خاص شغف تھا، جبکہ تصوف میں بھی آپ کو خاص مقام حاصل تھا۔

باطنی اصلاح کے لیے آپ نے معروف صوفی بزرگ مولانا فضلِ رحمان گنج مرادآبادیؒ سے تعلق قائم کیا اور ان سے خلافت و اجازت حاصل کی۔ اس صحبت نے آپ کی شخصیت میں اعتدال، اخلاص اور دینی غیرت پیدا کی۔

دینی و سماجی خدمات

مولانا مونگیریؒ کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ آپ نے ایک طرف تعلیم و اصلاح کے میدان میں کام کیا تو دوسری طرف باطل تحریکوں کے رد میں بھرپور جدوجہد کی۔ عیسائی مشنریوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے مقابلے کے لیے آپ نے علمی محاذ قائم کیا اور رسائل و کتب کے ذریعے اسلام کا مؤثر دفاع کیا۔ اسی طرح قادیانیت کے فتنہ کے خلاف بھی آپ نے بھرپور تحریک چلائی، متعدد کتابیں اور رسائل تحریر کیے اور خود دورے کر کے عوام کی اصلاح کی۔

ندوۃ العلماء کی تحریک

مولاناؒ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ندوۃ العلماء کی تحریک ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں میں مایوسی اور فکری انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ ایک طرف قدامت پسندی تھی اور دوسری طرف اندھی جدیدیت۔ مولاناؒ نے محسوس کیا کہ امت کو ایسے تعلیمی نظام کی ضرورت ہے جو قدیم دینی علوم اور جدید تقاضوں میں توازن قائم کرے۔

اسی مقصد کے تحت ۱۸۹۲ء میں کانپور میں ندوۃ العلماء

کا تصور پیش کیا گیا، جسے علماء نے قبول کیا اور مولاناؒ کو اس کا پہلا ناظم مقرر کیا گیا۔ بعد میں لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء قائم ہوا، جس نے برصغیر کی دینی تعلیم پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ مولاناؒ نے تقریباً گیارہ سال تک ندوہ کی نظامت سنبھالی اور اسے فکری و تعلیمی مرکز بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

تصانیف

مولانا مونگیری ایک صاحبِ قلم عالم بھی تھے۔ آپ نے مختلف موضوعات پر کئی کتابیں اور رسائل تحریر کیے، جن میں اسلام کے دفاع، عیسائیت اور قادیانیت کے رد، اور اصلاحِ امت جیسے موضوعات شامل ہیں۔ آپ کی تصانیف علمی ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم بھی ہیں، جو آپ کے اخلاص اور دردِ امت کی عکاس ہیں۔

وفات

زندگی کے آخری ایام میں مولاناؒ گردے کی بیماری میں مبتلا رہے، مگر ذکر و عبادت میں مشغول رہے۔ بالآخر ۱۳ر ستمبر ۱۹۲۷ء کو آپ کا انتقال ہوا۔ ہزاروں مریدین، شاگردوں اور عقیدت مندوں نے آپ کے جنازے میں شرکت کی۔ آپ کی وفات اگرچہ ایک عظیم نقصان تھی، لیکن آپ کے چھوڑے ہوئے علمی و فکری نقوش آج بھی زندہ ہیں۔

مولانا سید محمد علی مونگیریؒ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ عالم بھی تھے، صوفی بھی، مصلح بھی اور مدبر بھی۔ ندوۃ العلماء کی صورت میں آپ نے امت کو جو تحفہ دیا، وہ آپ کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ آپؒ کی زندگی اس بات کی روشن مثال ہے کہ اخلاص، علم اور حکمت کے ساتھ کی گئی کوششیں تاریخ کا رخ موڑ سکتی ہیں۔

☆☆☆

امت کی اصل ضرورت

صدیوں سے چلتے آ رہے فروعی اختلافات اور آپسی ٹکراؤ سے اب لوگ تھک چکے ہیں، دلائل کی پوری پوری لائبریریاں ان اختلافی مسائل کے رد و قبول پر کھڑی کی جا چکی ہیں۔ ان مسائل کو اچھالنے سے اب کوئی فائدہ نہیں، لہٰذا اب ایسے مسائل کو کتابوں میں بند رہنے دینا ہی دانش مندی ہے۔ کیوں کہ اس وقت امت ہم سے اختلافات نہیں بلکہ فکری رہ نمائی، عملی بصیرت اور ذمہ دارانہ کردار کی طالب ہے۔ اس وقت ہمارا مقابلہ الحاد و تشکیک، جدیدیت اور بے حیائی و بے دینی سے ہے۔ اور ان ہی کے تعاقب میں ہماری کوشش صرف ہونی چاہیے۔

مفتی نذیر احمد صاحب کشمیری
رکن تاسیسی آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ
بتاریخ: ۲ر دسمبر ۲۰۲۴ء
بمقام: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

مولانا مسیح الزماں خانؒ: سوانحی خاکہ

بلال احمد
خصوصی ثالث

پیدائش اور خاندانی پس منظر:

حضرت مولانا مسیح الزماں خانؒ ۱۲۵۶ ہجری بہ مطابق ۱۸۴۰ء میں شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام محمد عمر خان اور جد امجد کا نام داراب خان تھا۔ آپ افغان خلیل قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے ابتدائی تعلیم قدیم طرز کے مکتب میں ہوئی اور فارسی کی چند بنیادی کتابیں اپنے وطن شاہ جہاں پور میں پڑھیں۔

ابتدائی تعلیم اور اساتذہ

فارسی کے بعد کچھ کتابیں آپ نے اپنے شہر کے عالم میر احمد علی صاحب شاہ آبادی سے بھی پڑھیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ علمی ذوق بڑھنے لگا تو مزید تعلیم کے لیے ۱۲۷۹ ہجری میں اپنے شہرۂ آفاق بھائی کے پاس حیدر آباد دکن تشریف لے گئے اور وہاں ان کے ساتھ تحصیل علم میں مصروف ہوئے۔ (شمش تبزیز خان، تاریخ ندوہ)

بھائی کی رفاقت اور خدمات:

آپ کے بھائی محمد زمان خان تھے جو اپنے زمانے میں شہید کے لقب سے مشہور تھے۔ اس دور میں وہ دکن کے مشہور حکمران نواب افضل الدولہ کے استاد تھے۔ نواب صاحب کی وفات کے بعد ان کے فرزند نواب میر محبوب علی خان بہادر نظام الملک کی استادی پر ان کی تنخواہ ایک ہزار روپے ماہوار مقرر ہوئی تھی۔ (حیات مسیح: ۸)

شہید صاحبؒ کی شہادت ۱۲۹۲ھ میں واقع ہوئی۔ اس کے بعد ان کی جگہ مولانا مسیح الزماں خانؒ کو حضورِ نظام کی استادی پر مقرر کیا گیا۔ مولانا نے اس نہایت اہم منصب کو غیر معمولی ذمہ داری، حسنِ تدبیر اور خوش اسلوبی کے ساتھ سنبھالا (حیاتِ مسیح: ۱۳)

تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ پہلے میر تراب علی خان، سالار جنگ اول کے دونوں صاحبزادوں میر لائق علی خان اور میر سعادت علی خان کے استاذ رہے۔ بعد ازاں محرم ۱۲۹۳ھ میں ان کی باضابطہ تقرری چھٹے نظام حیدر آباد، نواب میر محبوب علی خان کے استاد کی حیثیت سے عمل میں آئی۔ (حیاتِ مسیح: ۶۷۔ وشمس تبریز خان، تاریخ ندوہ دوم: ۲۰)

ابتدا میں انہیں وہی ایک ہزار روپے ماہوار تنخواہ دی گئی جو ان کے بھائی کو ملا کرتی تھی، تاہم محلاتِ مبارک کی خدمت کے پیشِ نظر حضورِ نواب نے اس میں پانچ سو روپے کا اضافہ کر کے پندرہ سو روپے ماہوار مقرر فرما دیے۔ علاوہ ازیں، ان کے اہلِ خانہ کے لیے بھی الگ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا گیا۔ (حیاتِ مسیح: ۷۶)

تین سال بعد مولانا مسیح الزماں خانؒ کو نظامِ حیدر آباد کے تمام تعلیمی امور کا ناظم مقرر کر دیا گیا، جس سے دربارِ نظام میں ان کے علمی وقار اور اعتماد کا اندازہ ہوتا ہے۔ (تاریخِ ندوہ دوم: ۲۰)

چند مشہور تلامذہ:

مولانا کے شاگرد بڑے باوقار اور بڑے مرتبہ یافتہ

تھے۔ان میں سرفہرست:

۱:نظام نواب محبوب علی خان بہادر

۲:نواب ظفر جنگ بہادر

۳:نواب میر لائق علی خان بہادر (سالار جنگ ثانی)

۴:نواب میر سعادت علی خان بہادر

۵:نواب فخر الملک بہادر معین المہام۔

یہ تمام شخصیات اپنے دور کے نمایاں حکمران اور منتظمین تھے اور مولانا خان صاحب کی تعلیم وتربیت ان کی شخصیتوں کا اہم حصہ رہی۔

تحریک ندوۃ العلماء سے وابستگی

مولانا مسیح الزماں خانؒ ۱۸۹۵ء میں لکھنؤ میں تحریک ندوۃ العلماء کے دوسرے اجلاس عام میں شریک ہوئے اور انہیں رکنِ انتظامیہ مقرر کیا گیا۔(شمس تبریز خان، تاریخ ندوہ دوم)

۱۹/جولائی ۱۹۰۳ء کو مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے بعد تین سال کے لیے انہیں دار العلوم ندوۃ العلماء کا قائم مقام ناظم مقرر کیا گیا۔ ندوۃ العلماء کا جریدہ الندوہ ان ہی کے عہد نظامت میں شاہجہاں پور سے شروع کیا گیا تھا۔(ایضاًوسیرت مونگیری)

اخلاق وسیرت اور مقبولیت:

مولانا مسیح الزماں خانؒ نہ صرف حیدرہ آباد میں رہ کر ہر دل عزیز ہوئے بل کہ ان کی فطری خوبیوں، نیک مزاجی، تہذیب شرافت اور خوش خلقی نے بھی انہیں خاص مقام عطا کیا۔علم وفن میں بہت سے لوگ ممتاز تھے مگر دانشمندی، معاملہ فہمی، رسائی اور انتظامی لیاقت کے جو اوصاف مولانا موصوف میں تھے وہ کم ہی لوگوں میں پائے جاتے تھے۔ان ہی خوبیوں کی بدولت انہوں نے اپنے عظیم منصب کی ذمہ داریاں طویل عرصے تک نہایت خوش اسلوبی سے ادا کی۔ بڑوں کی اطاعت، ہم عمر احباب سے محبت ولطف اور چھوٹوں پر شفقت یہ تمام اوصاف انہیں ہر طبقے میں محبوب اور ہر دل عزیز بناتے تھے۔(حیات مسیح:۸۵)

مولانا مسیح الزماں خان کا انتقال ۷ادسمبر ۱۹۱۰ء کو ہوا۔

☆☆☆

تعلیمی سفر اور مستقبل کے تقاضے

عزیز طلبہ! آپ سب اس وقت اپنی زندگی کے نہایت اہم اور فیصلہ کن مراحل سے گزر رہے ہیں،اس میں آپ اپنے اندر ہر طرح کی علمی، تحقیقی، زبانی اور قلمی صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں۔فراغت کے بعد ان ہی صلاحیتوں سے آپ معاشرے میں دین کی اشاعت وحفاظت، جدید فتنوں کا تعاقب اور چیلنجوں کا سامنا کر سکیں گے اور ان ہی کے ذریعے دینی فرائض بہ حسن وخوبی انجام دے سکیں۔لہٰذا اپنے وقت کی قدر کریں اور پورے اخلاص، محنت اور جد وجہد کے ساتھ اپنے اندر صلاحیت وقابلیت پیدا کریں۔

مفتی نذیر احمد صاحب کشمیری

رکن تاسیسی آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

بتاریخ:۲/دسمبر ۲۰۲۴ء

بمقام: دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری: سوانحی خاکہ

یاسر عرفات
عالیہ ثالثہ شریعہ

نام اور ابتدائی تعلیم:

حضرت مولانا خلیل الرحمن سہارنپوری، مشہور استاد حدیث حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کے صاحبزادے تھے۔ مولانا نے ابتدائی تعلیم مدرسہ مظاہرِ علوم سے حاصل کی اور تکمیل اپنے والدِ محترم سے کی۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد مولانا نے کاروبار شروع کیا۔

تحریک ندوۃ العلماء سے وابستگی:

مولانا ندوۃ العلماء کی تحریک کے ابتدائی دور ہی سے وابستہ تھے اور اس کے اجلاسِ دوم میں بھی شریک ہوئے تھے، جو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ مولانا خلیل الرحمن سہارنپوری دین داری، خوش وضعی اور مستقل مزاجی میں علماء سلف کی ایک یادگار تھے۔

عہدے و مناصب:

مولانا کے علمی اور شخصی وقار، قدر و منزلت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی تحریر کے مطابق وہ مدرسہ مظاہرِ علوم سہارنپور مجلسِ انتظامیہ کے رکن منتخب ہوئے تھے، جس میں مولانا فیض الحسن صاحب، مولانا ذوالفقار صاحب دیوبندی، اور مولانا احسن نانوتوی جیسے کبار علماء شامل تھے۔

عبادت و ریاضت:

مولانا تہجد، جماعت کے ساتھ نماز اور تلاوتِ کلام پاک کا بڑی شدت سے التزام کرتے تھے، حتیٰ کہ ان کے بارے میں یہ بات بھی منقول ہے کہ رمضان المبارک میں ان کی زندگی کا ایک نمایاں اور روشن پہلو یہ تھا کہ وہ روزانہ ایک مکمل قرآنِ کریم کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا قرآنِ کریم سے کتنی محبت اور انسیت رکھتے تھے۔

لیکن بڑے افسوس کے ساتھ اور دل پر پتھر رکھ کر یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ ندوۃ العلماء کے دورِ انتشار میں علامہ شبلی نعمانیؒ کی مخالفت کی بنا پر ان کا تذکرہ ہندوستان کے متعدد بااثر جرائد میں اس طرح آتا رہا کہ ان کی خوبیوں پر پردہ پڑ گیا۔ وہ ایک جامد عالم کی حیثیت سے پیش کیے گئے، اس سے ان کی زندگی کے مؤثر اور روشن پہلو پسِ پردہ رہ گئے۔

سانحۂ ارتحال

مولانا کی وفات ۴/فروری، بہ مطابق ۱۹۳۶ء کو اپنے آبائی وطن سہارنپور میں ہوئی۔

☆☆☆

حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کا سوانحی خاکہ

وسیم یوسف
عالیہ ثانیہ شریعہ

پیدائش، ولدیت اور خاندان:

حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ ۲۲ ر دسمبر ۱۸۶۹ء (مطابق ۱۸ / رمضان المبارک ۱۲۸۶ھ) کو دائرہ شاہ علم اللہ، تکیہ رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام سید احمد رکھا گیا لیکن مشہور عبدالحی کے نام سے ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام مولوی حکیم سید فخرالدین صاحب تھا جنہوں نے علمی و باطنی کمالات اور اصناف سخن پر یکساں قدرت حاصل کر کے اپنے زمانے میں فرید عصر کی حیثیت حاصل کی اور تصنیفات کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا۔ آپ کا پدری سلسلۂ نسب حضرت امام حسنؓ پر منتہی ہوتا ہے۔ اس سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی جس نے ہندوستان کو اپنے علمی و باطنی کمالات سے فیض یاب کیا وہ شیخ عبدالقادر جیلانی کے بھانجے شیخ الاسلام امیر قطب الدین محمد المدنی کی ذات تھی۔

ابتدائی تعلیم و تربیت:

مولانا سید عبدالحی حسنیؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے ننھیال اور ددھیال میں پائی۔ چناں چہ آپ نے ابتدائی صرف ونحو کی کتابیں حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب سے پڑھی تھیں۔ تکیہ، ضلع رائے بریلی میں دادی صاحبہ اور ہسوہ، ضلع فتحپور میں نانی صاحبہ کی مادرانہ شفقتیں اور دانش مندانہ تعلیم و تربیت؛ ان کی اخلاقی و ذہنی نشوونما میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کو بچپن ہی میں فن خطاطی کی تعلیم دی گئی جس کے نتیجے میں آپ کا خط نہایت عمدہ اور پختہ ہو گیا تھا۔

تعلیمی سرگرمیاں:

مولاناؒ نے الہ آباد جا کر دو سال میں مولانا محمد حسین الہ آبادی اور دوسرے علماء سے شرح جامی اور شرح تہذیب کا کچھ حصہ پڑھا۔ پھر چند مہینوں کے لیے فتح پور جا کر مولانا نور محمد صاحب کے پاس فقہ اور کانپور میں مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بھی کچھ حصہ اصول الشاشی اور کچھ حصہ شرح جامی اور قطبی کا پڑھا، اسی طرح مولانا فتح محمد صاحب تھانویؒ سے بھی شرح شافیہ اور اصول الشاشی کا کچھ حصہ پڑھا۔

جب والدۂ محترمہ کا سایہ سر سے اٹھا تو ۱۸۸۸ء میں آپ نے لکھنؤ کا رخ کیا، جہاں آپ نے نہایت انہماک، یکسوئی اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے تعلیمی سفر کو آگے بڑھایا۔ تنگ دستی و جفاکشی کے باوجود آپ نے محنت و مشقت سے تعلیمی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے متعدد جید علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ چناں چہ آپؒ نے مولانا نعیم اللہ صاحب فرنگی محلی سے ہدایہ، سراجی، شرح عقائد اور نخبۃ الفکر پڑھی، مولانا امیر علی صاحب سے تفسیر جلالین مکمل اور مولانا فضل اللہ صاحب سے مزید کچھ کتابیں پڑھیں۔

تکمیل علوم و اجازت:

مولانا سید عبدالحی حسنیؒ نے لکھنؤ میں چار پانچ برس تعلیم کے بعد ۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء میں وطن واپسی اختیار کی، نکاح کے بعد بھوپال تشریف لے گئے، جہاں مختلف اکابر علماء سے علومِ درسیہ، ریاضی، ادب، حدیث اور طب کی تحصیل کی۔ آپ نے مولانا

حکیم سید عبدالعلیؒ سے بھی طب کی کتابیں پڑھیں۔

۱۸۹۴ء میں آپ کو دہلی اور لکھنؤ کے متعدد اکابر علماء سے تدریس اور اجازت حدیث حاصل ہوئی۔ اسی سال مولانا شیخ حسین بن محسن الانصاری الیمانی نے تمام علوم میں تحریری و تقریری اجازت مرحمت فرمائی۔ دہلی میں مختصر قیام کے دوران مولانا سید نذیر حسین دہلویؒ سے صحاحِ ستہ اور ان کے ملحقات کی سند اور اجازت ملی، جب کہ مولانا قاری عبدالرحمن پانی پتیؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بھی کتبِ حدیث اور مسلسلات کی اجازت حاصل ہوئی۔ ۱۸۸۹ء کو لکھنؤ کے قیام کے دوران آپ گنج مراد آباد تشریف لے گئے، جہاں مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ نے حصنِ حصین اور دیگر کتبِ حدیث کے ساتھ ساتھ مسلسلات کی تدریس و اجازت مرحمت فرمائی۔

ندوۃ العلماء سے وابستگی:

شوال ۱۸۹۴ء میں آپ نے تحریک ندوۃ العلماء کے پہلے کانپور کے اجلاس میں شرکت کی اور شوال ۱۸۹۵ء لکھنؤ میں ہونے والے دوسرے جلسے میں بھی موجود رہے۔ اس دوسرے اجلاس کے بعد آپ اس تحریک کی ملک گیر سرگرمیوں سے مستقل طور پر وابستہ ہو گئے۔ ۱۸۹۵ء کے علمی و تاریخی دورہ کے بعد آپ نے اپنے وطن دائرۂ شاہ علم اللہ میں ''انجمن آلِ ہاشم'' کے نام سے ایک اصلاحی انجمن کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کے اجلاسوں کے ذریعہ آپ نے تحریک ندوۃ العلماء کا تعارف پیش کیا اور اراکینِ انجمن اور عوام کو اس تحریک کو دل و جان سے قبول کرنے پر ابھارا۔

دسمبر ۱۸۹۵ء میں ندوۃ العلماء کے جلسۂ انتظامیہ میں آپ ناظم ندوۃ العلماء مولانا محمد علی صاحب کے معاون و نائب منتخب ہوئے۔ ندوہ کا دفتر کانپور میں ہونے کی وجہ سے آپ کا قیام بھی کانپور ہی میں رہا۔ ستمبر ۱۸۹۸ء کو ندوہ کا دفتر کانپور سے لکھنؤ منتقل ہونے کی وجہ سے آپ کا قیام لکھنؤ میں ناگزیر ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد دفتر نظامت کا تین شعبوں میں منقسم ہونے پر آپ شعبۂ مراسلات و دفتر کے معتمد قرار پائے۔

مارچ ۱۹۱۵ء کو مولانا خلیل الرحمن سہارنپوریؒ نے نظامت کے عہدہ سے استعفاء کے بعد مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کو سب نے بالاتفاق ناظم منتخب کیا۔ پانچ سالہ نظامت کی مدت پوری ہونے کے بعد آپ دوبارہ اتفاق رائے سے ناظم منتخب ہوئے۔ آپ ربع صدی سے زائد مختلف حیثیتوں سے ندوۃ العلماء سے اس کے ہر قسم کے نشیب و فراز میں ہمسر و ہمدم رہے۔ آپ نے ابتدا بہ قدر کفاف معاوضہ بھی لیا، پھر ۱۹۰۵ء میں آپ نے معاوضہ لینے سے کلی طور معذرت فرما دی اور کسب معاش کے لیے ۳۸ سال کی عمر میں باقاعدہ مطب شروع کیا اور آخر عمر تک اس کا سلسلہ جاری رکھا۔

بیعت و اجازت

مولانا سید عبدالحی حسنیؒ نے تصوف و سلوک کی پرنور فضا ہی میں شعور کی آنکھیں کھولیں تھیں۔ آپ بچپن ہی میں صحبت اہل اللہ سے مستفید ہوئے، چناں چہ آپ کو ہسوہ میں مولانا عبدالسلام واسطیؒ اور دائرۂ شاہ علم اللہ میں حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب کی صحبت حاصل ہوئی۔ ۱۸۸۸ء میں ۱۹ سال کی عمر میں آپ کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے دو طریقے یعنی سلسلۂ چشتیہ صابریہ اور سلسلۂ نقشبندیہ احمدیہ میں بیعت حاصل ہوئی۔ آپ نے منازل سلوک چار نقشبندی مجددی حضرات کی خدمت میں طے کیے۔ آپ کو حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب اور والد ماجد اور حکیم امین الدین صاحب سے چاروں مشہور سلاسل میں خلافت و اجازت حاصل ہوئی۔

۱۲ رجنوری ۱۸۹۵ء کو آپ نے ہسوہ، فتح پور سے ایک سفر شروع کیا جو ۲۱ رفروری کو ختم ہوا۔ اس میں آپ دہلی، پانی پت، سرہند، کیمپ انبالہ، دیوبند، پیران کلیر، سہارنپور، گنگوہ، نگینہ

اور متعدد قصبات میں گئے اور وہاں کے مشاہیر، علماء و مشائخ کے دروس میں شرکت کر کے اجازتِ حدیث حاصل کی اور ان سے خوب علمی و باطنی استفادہ کیا۔

اھم تصنیفات

مولاناؒ کی عربی زبان میں سب سے اہم تصانیف میں: تهذيب الأخلاق، نزهة الخواطر، الثقافة الإسلامية في الهند اور جنة المَشرق ہے۔ اردو زبان میں: ''یادِ ایام'' اور ''گلِ رعنا'' ان کی قابل ذکر تصانیف ہیں۔

سانحۂ ارتحال

مولانا حکیم سید عبدالحیؒ حسنی کی وفات ۱۵ / جمادی الثانی ۱۳۴۱ھ مطابق ۲ / فروری ۱۹۲۳ء کو جمعہ کے دن لکھنؤ میں ہوئی۔ راتوں رات نعش کو ان کے آبائی گاؤں تکیہ رائے بریلی لے جایا گیا۔ دائرہ شاہ علم اللہ میں ایک بڑی تعداد کے ساتھ جنازہ پڑھا گیا اور شاہ علم اللہ کے پائیں دفن کیا گیا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر قمری حساب سے ۵۵ اور شمسی حساب سے تقریباً ۵۳ سال کی تھی۔

(حیاتِ عبدالحی: ۲۵۳)

☆☆☆

فروعی مسائل میں فراخ چشمی

حضرت تھانویؒ کے ایک خلیفہ مفتی محمد حسن امرتسریؒ (بڑے حنفی دیوبندی الفکر علماء میں) تھے، ان کے ایک دوست مولانا محمد حسین ہزاروی (جو مسلک اہل حدیث سے منسلک) تھے، وہ ان کے ساتھ حضرت تھانوی کی خدمت میں آئے، مولانا امرتسری نے مولانا تھانوی سے بتا دیا کہ ان کا تعلق مسلک اہل حدیث سے ہے، مولانا بہت خوش ہوئے اور ان سے باقاعدہ ملتے رہے۔ ایک دن مولانا تھانوی نے مولانا امرتسری سے پوچھا: ''کیا بات ہے کہ نماز میں مولانا حسین صاحب کے آمین کی آواز نہیں آتی ہے''؟

مولانا امرتسری نے جواب دیا: ''شاید آپ کے مسلک کی رعایت میں ایسا کرتے ہیں۔''

مولانا تھانوی نے کہا: ''آپ ان سے کہہ دیجئے کہ وہ جس چیز کو سنت سمجھتے ہیں اس کو ترک کرنے کا بوجھ میری گردن پر نہ ڈالیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک عمل سمندر کے اُس پار سنت ہو اور اِس پار بدعت ہو۔ مولوی صاحب سے کہئے کہ وہ آمین بالجہر کہیں، یہاں ان کو کوئی روکنے والا نہیں۔'' (بہ حوالہ: بزم ارجمندان: ۳۰۳)

تالیف: مولانا محمد اسحاق بھٹی

مولانا سید نواب علی حسن خان: سوانحی خاکہ

پیر مبشر منظور
عالیہ ثالثہ شریعہ

ولادت و تعلیم

حضرت مولانا نواب علی حسن خان چار شنبہ ۴ / ربیع الآخر ۱۲۸۳ھ کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام نواب صدیق حسن خان تھا۔

پانچ سالہ عمر میں مکتب میں قرآن شریف کی تعلیم پائی اور اسے دو سال میں مکمل کر لیا۔ اس کے بعد مولوی محمد احسن بلگرامی (مؤلف: ''ارتنگ فرہنگ'' و ''لغت شاہجہانی'') سے فارسی اور نحو و صرف پڑھی۔ اس کے بعد مولانا سلامت اللہ جیراج پوری، مولانا پیر ذوالفقار احمد اور مولانا عبدالرشید شوپیانی کشمیری سے مختصرات ادب و تاریخ اور بعض کتب وحدیث اور قصائد عربیہ کا اکتساب کیا۔ اسی دوران فنون سپہ گری اور شہ سواری کی تعلیم بھی جاری رہی (تاریخ ندوۃ العلماء)

مولوی مظفر حسین صاحب گوپاموی اپنے تذکرہ ''روز روشن'' میں نواب صاحب کی ذہانت و نظامت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ابھی ان کی عمر ۱۳ / سال کی ہیں، مگر جودت و ذکاوت جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کی ہیں، انہیں عقل کل اور جوہر اول کہا جا سکتا ہے، اگر آپ کو یقین نہ ہو تو ان کے تذکرہ ''صبح گلشن'' اور ''شرح مرقات'' پر نظر ڈالیں''۔

عهد نظامت ندوة العلماء:

حضرت مولانا نواب حسن خان ندوۃ العلماء کے ان ارکان میں تھے جو شروع سے اخیر تک اس کے ساتھ پوری دل چسپی اور ہمدردی و خلوص سے متعلق رہے، جن سے اس تحریک کو ایک خاص وقار و اعتبار اور حسن قبول حاصل رہا۔ وہ عرصے تک حضرت مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کے دور نظامت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد مالیات رہے اور دوسرے انتظامی امور میں بھی حصہ لیتے رہے۔ ان کے انتقال ۱۵ / جمادی الآخر ۱۳۴۱ھ (بہ مطابق ۲ / فروری ۱۹۲۳ء) کے بعد وہی ناظم منتخب ہوئے اور اپنی عمر کے آخری دن تک ندوہ کے لیے اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔

ندوة العلماء کے لیے مرحوم کی خدمات:

ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد میں اشاعت اسلام اور فتنہ ارتداد کا انسداد اہم تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد آریہ سماج کے ارتداد و مخالف تحریک کے جواب میں ندوہ نے سرگرمی دکھائی۔ ۱۹۲۳ء کے اجلاس میں فتنۂ ارتداد کے مقابلے کے لیے تبلیغی شاخ قائم کرنے اور ۲۰۰ ماہوار فنڈ جمع کرنے کی تجویز منظور ہوئی۔ مولانا سید سلیمان اور مولانا مسعود علی کو نظام عمل تیار کرنے کا حکم دیا گیا۔

مولانا سید عبدالحیؒ کی وفات کے بعد اگرچہ کچھ رکاوٹیں آئیں، مگر بعد میں ندوہ کے نظام کو از سرِ نو منظم کر کے اس تحریک کو مضبوط بنایا گیا۔ ان کے دورِ نظامت میں ندوہ کے چار بڑے اجلاس اس تحریک کے فروغ میں سنگِ میل ثابت ہوئے۔

فن شاعری:

نواب صاحب خاندانی روایت کے مطابق اردو، عربی اور فارسی کے ماہر شاعر تھے۔ فارسی غزل میں متاخرین میں

نمایاں مقام رکھتے تھے اردو شاعری میں لکھنوی اسلوب نمایاں تھا مگر ان کے مضامین سنجیدہ، اصلاحی اور اخلاقی نوعیت کے تھے۔ وہ اسلامی ادب کے نمایاں کارگزاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

تصنیف وتالیف:

اپنی خاندانی روایت کے مطابق نواب صاحب کو بھی اردو اور فارسی میں تصنیف وتالیف کا بڑا پختہ مذاق حاصل تھا، اگر وہ اس طرف توجہ کرتے تو اپنے بعض معاصرین کی طرح وہ بھی ایک نمایاں اور مشہور مصنف ہوتے۔ پھر بھی ان کی کتابوں میں تذکرہ ''صبح گلشن'' اور ''مآثر صدیقی'' ایسی کتابیں ہیں جو ایک اچھے مصنف کی حیثیت سے ان کا نام باقی رکھیں گی۔

مولانا علی میاںؒ لکھتے ہیں:

''آپ ادیب، عالم، سخن فہم، سخن سنج اور صاحب قلم تھے۔ فطرۃ القلم اور مآثر صدیقی ان کی بہترین کتابیں ہیں۔ اخیر میں مردم دیدہ کے نام سے ان باکمالوں کے حالات لکھ رہے تھے، جن سے ان کو ملنے کا اتفاق ہوا۔'' (حیات عبدالحی: ۲۲۳)

وفات:

۳/رمضان ۱۳۵۵ھ (بہ مطابق ۱۹/نومبر ۱۹۳۶ء) کو ۷۲/سال کی عمر میں مالک حقیقی سے جا ملے۔

ان کے انتقال پر علامہ سید سلیمان ندوی نے معارف میں اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا تھا کہ: ''مرحوم ایک ایسے قدیم اور باوقار خاندان کی آخری یادگار تھے جنہوں نے برصغیر کے علمی، تعلیمی، سیاسی اور تمدنی انقلاب اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اگر چہ وہ بھوپال کے قدامت پسند ماحول میں پیدا ہوئے، مگر فطرتاً روشن دل اور متاثر پذیری کے باعث نئی تحریکوں سے جڑتے چلے گئے۔ سرسید کی تعلیمی تحریک ہو یا ندوۃ العلماء کی دینی تحریک ہی ہر میدان میں انہوں نے دل و جان سے خدمات انجام دیں۔ ندوہ کے اعزازی ناظم رہے، دارالمصنفین کے بانی ارکان میں شامل تھے اور لکھنؤ کی ہر سنجیدہ علمی تحریک میں ان کا نام نمایاں رہا''۔

(اتحاد النبلا و تاریخ ندوۃ العلماء)

☆☆☆

طلبہ کو اردو میں مہارت پیدا کرنے کی ضرورت

علماء کی بنیادی ذمہ داری دین اسلام کی تعلیمات کو عام فہم انداز میں لوگوں تک پہنچانا ہے۔ اس مقصد کے لیے عوام کی زبان میں مہارت ضروری ہے، اور برصغیر میں عوام کی اکثریت اردو بولتی اور سمجھتی ہے۔ اگر علماء کو اردو پر عبور حاصل ہوگا تو وہ عوام کے دلوں میں اترنے والے انداز میں دین کی بات پہنچا سکیں گے۔ لہذا علماء کے لیے اردو سیکھنا نہایت ضروری ہے کیوں کہ یہ ایک ایسی زبان ہے جو برّصغیر کے مسلمانوں کی دینی، علمی وتہذیبی وراثت کی نمائندگی کرتی ہے۔

مولانا محمد رحمت اللہ میر قاسمی
بانی ومہتمم دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کشمیر
بتاریخ: یکم دسمبر ۲۰۲۴ء
بمقام: دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی: حالات زندگی

محمد زاہد

عالیہ رابعہ شریعہ

پیدائش وولدیت:

حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی ندویؒ ایک معروف عالم دین، طبیب اور ندوۃ العلماء کے ناظم تھے۔کنیت ابوجعفر اور نسبت حسنی تھی۔وہ ۲۲/جمادی الاولی ۱۳۱۱ھ بہ مطابق ۱۸۹۳ء میں ضلع فتح پور کے قصبہ ہنسوہ میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد محترم حضرت مولانا حکیم عبدالحئی حسنیؒ بھی ندوۃ العلماء کے ناظم تھے اور آپ کے باپ شریک بھائی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ بھی ندوۃ العلماء کے ناظم تھے۔ڈاکٹر صاحب سب سے بڑے فرزند تھے۔

تعلیم وتربیت:

ابتدائی تعلیم اپنے ننہال ہنسوہ میں حاصل کی،مکتب نشینی مولانا عبدالحکیم کیرانوی کے پاس ہوئی۔آٹھ سال کی عمر میں والدہ محترمہ کا انتقال ہوگیا۔ناظرہ قرآن مکمل ہونے کے بعد عربی تعلیم شروع کی،فارسی زبان اپنے دادا ''حکیم سید فخرالدین'' سے سیکھی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور وہاں ادب عربی ''سید علی زینبی'' سے، فقہ و اصول ''مولانا شبلی جیراج پوری'' سے علم ہیئت ''مولانا سلطان محمد کابلی'' سے اور بعض درسیات اپنے والد محترم سے پڑھی۔اس کے بعد فضیلت کے لیے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور وہاں صحیح بخاری و سنن ترمذی شیخ الھند محمود حسن دیوبندیؒ سے اور سنن ابی داؤد علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے پڑھی۔اسی طرح حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بھی استفادہ کیا۔ بیعت کا تعلق بھی ان ہی سے تھا۔

۱۳۳۰ھ میں لکھنؤ واپس آئے اور طب پر توجہ شروع کردی۔والد محترم اور دادا بھی حکیم وطبیب تھے۔ چناں چہ طب کی ساری اولین کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اور پھر حکیم اجمل خان کے مطب میں چھ ماہ رہ کر ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ڈاکٹری کی بھی معلومات حاصل کی۔

۲۱ برس کی عمر میں دینی اور طب کی تعلیم سے فراغت کے بعد ''مولانا سید ابوالقاسم ہنسوی زیدی وسطی'' کی صاحبزادی سے نکاح ہوا۔اس کے بعد انگریزی میں مہارت حاصل کرکے ''ایلو پیتھک'' پڑھی، انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد ''بی ایس سی'' کیا۔پھر ایم بی بی ایس (MBBS) کرکے ڈاکٹر بن گئے۔(سوانح سید محمد الحسنی،ص:۴۴)

عملی زندگی:

۱۳۴۳ھ/۱۹۲۵ء میں والد محترم کا انتقال ہو گیا، وفات کے دو سال بعد میڈیکل کالج کا امتحان پاس کیا اور اسی سال نومبر میں سند ملی۔جنوری ۱۹۲۶ء سے گوئن روڈ،لکھنؤ میں مطب کا اغاز کیا اور وفات تک برابر مطب میں رہتے۔شہر وملک کے کامیاب معالجوں،طبیبوں اور ڈاکٹروں میں شمار ہونے لگے۔ اسی سال حج کو تشریف لے گئے۔ وہاں شاہ عبدالعزیز بن عبدالرحمن آل سعود سے ملاقات بھی کی۔وہاں کے علماء ومشائخ اور کتب خانوں سے بھی استفادہ کیا۔(حیات عبدالحئی:۲۶۷)

ڈاکٹر صاحب کے والد محترم ندوہ کے ناظم اور اولین بانیوں میں سے تھے ۔ ۱۱؍جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ کو ڈاکٹر صاحب کورکن انتظامیہ میں منتخب کیا گیا۔ ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء میں نائب ناظم اور محرم ۱۳۵۰ھ بہ مطابق جون ۱۹۳۱ کو ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب ہوئے اور وفات تک ناظم رہے۔ ڈاکٹر صاحب کے دور نظامت میں تعلیم کی اصلاح، عالم عرب سے روابط اور عالیشان مسجد کی تعمیر ہوئی۔ (سوانح مولانا سید محمد الحسنی : ۴۷)

وفات وتدفین:

سال ۱۹۵۶ء سے ڈاکٹر صاحب مسلسل علیل رہنے لگے اور کمزوری بڑھتی گئی۔ بالآخر ۷؍مئی ۱۹۶۱ء کو لکھنؤ گوئن روڈ کے مکان میں ۷۰؍سال کی عمر میں وفات پائی۔ تدفین کے لیے جسد خاکی تکیہ کلاں، رائے بریلی لے جایا گیا اور دائرہ شاہ علم اللہ کے قبرستان میں شاہ علم اللہ کے سرہانے مدفون ہوئے۔ (ایضا: ۴۷)

☆☆☆

علماءِ دین کے فرائض

آج کل ہمارے علماء کا کام صرف پڑھنا پڑھانا، مسئلے بتانا اور فتوے لکھنا سمجھا جاتا ہے لیکن اب وقت آ چکا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے پچھلے سبق کو دہرائیں اور دیکھیں کہ ان کا کام صرف علم و نظر تک محدود نہیں تھا بل کہ سعی و عمل اور جد وجہد اور عملی خدمت بھی ان کے منصب کا ایک بہت بڑا فریضہ ہے، ہر آبادی جہاں وہ رہیں وہ ان کی سعی و خدمت سے آباد رہے، وہاں کے جاہلوں کو پڑھانا، وہاں کے نادانوں کو سمجھانا، وہاں کے غریبوں کی مدد کرنا، وہاں کی ضرورتوں کو پورا کرنا، وہاں کے امیروں کو حق کا پیغام سنانا، وہاں کے معذوروں کی خدمت کرنا، وہاں کے بھولے بھٹکوں کو راہ دکھانا، مسلمانوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کرنا، ان کو دنیا کی ضرورتوں سے باخبر کرنا ضرورت کے ہر موقع پر آگے بڑھنا اور اپنے علم و عمل کی ہر کوشش سے ان کو فائدہ پہنچانا ایک عالم دین کے فرائض ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ
معارف: ۱، جلد ۴۱، ۱۹۳۸ء

مفکر اسلام کا مختصر سوانحی خاکہ

شہباز بشیر شاہ
خصوصی ثانی

مختصر حالات زندگی

۵ ردسمبر ۱۹۱۳ء کو اتر پردیش ہندوستان کے تاریخی شہر رائے بریلی کے قریب تکیہ کلان گاؤں میں ایک ایسا چراغ روشن ہوا، جس نے برصغیر اور عالم اسلام کی فکری اور روحانی تاریخ میں ایک سنہرہ باب قائم کیا۔ یہ تھے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی جنہیں محبت و احترام سے ''علی میاں ندوی'' کہا جاتا ہے۔ آپ کا شجرہ نسب حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے جا کر ملتا ہے، جس کی وجہ سے آپ کے نام کے ساتھ حسنی لگایا جاتا ہے۔ آپ ایک گہرے علمی و روحانی پس منظر رکھنے والے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد محترم علامہ سید عبدالحی حسنیؒ جن کا شمار بڑے علماء میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب ''نزھۃ الخواطر'' اسلامی تاریخ کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ والدہ محترمہ بھی تقوی اور عبادت میں نمایاں مقام رکھتی تھی۔ کم عمری ہی میں یتیمی کا صدمہ جھیلنا پڑا، مگر والدہ کی تربیت اور بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کی سرپرستی میں علمی سفر جاری رہا۔

تعلیم و تربیت

ابتدائی تعلیم رائے بریلی کے قیام میں آئی، جس میں آپ نے تسمیہ کی تعلیم اپنے چچا حضرت مولانا سید عزیز الرحمٰنؒ صاحب سے پائی۔ چوں کہ زیادہ تر قیام لکھنؤ ہی میں ہوتا تھا، اس لیے باقاعدہ تعلیم کا آغاز وہیں سے ہوا۔ حروف شناسی، قرآن مجید اور اردو کی تعلیم حافظ محمد سید صاحب سے پائی۔ اردو کی ابتدائی تعلیم محترم مولانا عزیز الرحمٰنؒ صاحب کے یہاں پائی جو اس وقت دفتر ندوۃ العلماء میں کام کرتے تھے۔ آپ کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ نے آپ کو شیخ خلیل بن محمد عرب یمانیؒ کے سپرد کر دیا، جو اس زمانے کے عرب کے ماہر اور کامیاب ترین استاد مانے جاتے تھے۔ آپ نے تعلیم کی تکمیل دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فرمائی۔ اس وقت دارالعلوم کے مہتمم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا حیدر حسن خان صاحب سے بھی استفادہ کیا جو آپ کے بڑے شفیق اور محبوب استاد تھے۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں کچھ دنوں تک مولانا حسین احمد مدنیؒ سے حدیث کے درس کی سعادت بھی حاصل فرمائی اور لاہور کے سفر میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے تفسیر بھی پڑھی۔

تدریسی و علمی خدمات

صرف ۲۰ رسال کی عمر میں ۱۹۳۴ء میں ندوۃ العلماء نے اپ کو بہ حیثیت استاد مقرر کیا۔ تقریباً دس سال تک تفسیر ادب اور حدیث کی تعلیم دی۔ آپ کے اندر خوبیاں اور صلاحیتیں دیکھ کر ۱۹۵۱ء میں آپ کو نائب معتمد تعلیم بنایا گیا۔ ۱۹۵۴ء میں جب علامہ سید سلیمان ندویؒ کا انتقال ہوا تو آپ معتمد تعلیم کے منصب پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں جب آپ کے بڑے بھائی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ پر مجلس شوری نے آپ کو ناظم منتخب کیا۔ ۱۹۸۵ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر بنائے گئے۔

۱۹۸۰ء میں آپ کی عظیم الشان عربی ادب کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مولاناؒ نے اس ایوارڈ کی پوری رقم عطیہ میں دے دیا۔

تصنیفی خدمات

آپ کی بے شمار عربی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی کتابیں موجود ہیں۔ عربی کی چند مشہور کتابیں درج ذیل ہیں:

ماذا خسر العالم بإنحطاط المسلمين، رجال الفكر والدعوة في الإسلام، الحسن البصري، روائع اقبال، الدعوة إلى الله حماية المجتمع من الجاهلية.

اردو کی مشہور کتابیں: تاریخ دعوت وعزیمت، کاروان زندگی، نقوش اقبال، سیرت سید احمد شہید، المرتضیٰ وغیرہ۔

تحریک پیام انسانیت کی بنیاد

آپ نے ۱۹۷۵ء میں تحریکِ پیامِ انسانیت کی بنیاد رکھی۔ اس تحریک کے اغراض ومقاصد کے بارے میں خود مولاناؒ رقم طراز ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''ہم لوگوں میں اس جذبے کو پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ان میں ان حقیقتوں کی پیاس پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ زندگی محض کھانے پینے کا نام نہیں! انسان کی زندگی محض مادی یا حیوانی زندگی کا نام نہیں! ہم ایک نیا ذوق لے کر آئے ہیں۔ آج کی مادی دنیا میں یہ بات نئی ہے، دراصل یہ بات نئی نہیں، دنیا کے سب پیغمبر جو ہر قوم کے پاس آئے، یہی پیغام لائے اور سب سے زیادہ طاقت اور وضاحت کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری طور پر یہ بات کہی۔ یہ حقیقت چوراہوں پر کہنے کے لائق ہے، لوگ پیٹ کے گرد چکر لگا رہے ہیں، اصلی زندگی دم توڑ رہی ہے، انسانیت کی پونجی لٹ رہی ہے۔ ہم ایک صدا لگانے آئے ہیں، حق کی صدا، دنیا اس صدا سے نامانوس ہے، مگر ہم دنیا سے مایوس نہیں، انسانوں کے پاس اب بھی ضمیر ہے، یہ ضمیر مردہ نہیں ہوا، اس پر گرد وغبار آ گیا ہے، اگر وہ گرد وغبار جھاڑ دیا جائے اور اس کو آلودگی سے صاف کر دیا جائے تو اب بھی اس کی گنجائش ہے کہ وہ حق کو قبول کرلے اور اس میں ایمانی شعور پیدا ہو۔'' (پیام انسانیت: ۲۹)

وفات

بیسوی صدی کی آخری تاریخ ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء بہ روز جمعہ رائے بریلی میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے آپ کا وصال ہوا۔ ملک ہندوستان سے لے کر بیرون ملک تک بڑے بڑے علماء آپ کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔ بہ ظاہر یہ چراغ بجھ گیا، لیکن اس کی روشنی آج بھی لاکھوں دلوں کو ایمان، محبت اور اخوت کا پیغام دے رہی ہے۔ آپ کی تصنیفات، خطبات اور قائم کردہ ادارے آنے والی نسلوں کے لیے دین کی اصل روح سے جڑنے کا ذریعہ ہے۔

☆☆☆

خانوادۂ حسنی کا لعل بدخشاں

مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

طلحہ نذیر ندوی
تدریب افتاء

ولادت وتعلیم

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۹ءکو تکیہ کلاں رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ والدصاحب کا نام رشید احمد حسنیؒ تھا جو اپنے خاندان کے نہایت ہی معزز بزرگ شمار ہوتے تھے۔ والدہ سیدہ امۃ العزیز صاحبہ تھیں جو رشتہ میں مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی ہمشیرہ تھیں۔

ابتدائی تعلیم اپنے گھر ہی پر حاصل کی، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کی غرض سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا اور عربی ادب میں اختصاص کیا، ساتھ ہی ایک سال دارالعلوم دیوبند کے خوان علم سے بھی خوشہ چینی کی۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ جیسے کبار علماء ومشائخ سے استفادہ کا شرف حاصل کیا۔ ۱۹۴۸ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلیم مکمل کی، یہاں اپنے خال معظم مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مولانا اویس نگرامی اور شیخ محمد عطار حمہم اللہ سے خوب استفادہ کیا۔ ۱۹۵۰ء میں حجاز مقدس کا سفر حصول علم کی غرض سے کیا، جہاں امام حرم مکی شیخ عبدالمہیمن مصریؒ اور دوسرے علماء سے استفادہ کیا۔

تدریسی خدمات ومشہور تلامذہ

۱۹۴۹ء میں شعبہ ادب عرب کے معاون استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ادیب دوم مقرر ہوئے۔ اور ۱۹۵۵ء میں صدر شعبہ عربی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں عمید کلیة اللغة العربية دار العلوم ندوة العلماء مقرر ہوئے۔

آپ کے تلامذہ میں مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی، مولانا تقی الدین ندوی، پروفیسر محسن عثمانی ندوی، شیخ عبدالوہاب حلبیؒ، مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ، مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہریؒ، مولانا تقی الدین فردوسی ندویؒ، مولانا محمد زکریا ندوی، مفتی نیاز احمد ندوی، مولانا خالد غازی پوری، مولانا عبدالعزیز بھٹکلی، شیخ احمد فہمی زمزم وغیرہ جیسے اساطین علم شامل ہیں۔

مناصب واعزازات

عربی زبان وادب کی خدمات کے سلسلے میں ۱۹۸۲ء میں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازے گئے۔ ۱۹۹۳ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم بنائے گئے اور ۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء کو مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے انتقال کے بعد آپ ناظم ندوۃ العلماء مقرر ہوئے۔ ۲۰۰۳ء میں فقیہ العصر قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے انتقال کے بعد صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ منتخب ہوئے۔ اس کے علاوہ آپ نائب صدر رابطہ ادب اسلامی، صدر دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش، رکن

تاسیسی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ، صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو، ٹرسٹی آکسفورڈ سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز (آکسفورڈ یونیورسٹی برطانیہ)، سرپرست تحریک پیام انسانیت، رکن دارالمصنفین اعظم گڑھ، رکن شوری دارالعلوم دیوبند اور بھی بہت ساری دینی تنظیموں، اداروں اور ادبی انجمنوں کے رکن اور سرپرست تھے۔

صحافتی خدمات

آپ نے صحافت کے میدان میں بھی خدمات جلیلہ انجام دیں۔ البعث الاسلامی (عربی مجلہ ندوۃ العلماء)، تعمیر حیات (اردو مجلہ ندوۃ العلماء)، الرائد (عربی مجلہ ندوۃ العلماء جس کے آپ بانی بھی ہیں)، سچا راہی (ہندی ماہنامہ ندوۃ العلماء)، معارف اعظم گڑھ، کاروان ادب اور درون و بیرون اخبارات و رسائل میں آپ کے مضامین تسلسل کے ساتھ چھپتے رہے اور بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے رہے۔

تصنیفی خدمات

آپ نے عربی اور اردو میں تقریباً تین درجن کتابیں تصنیف فرمائیں، جن میں مقالات في التربية والمجتمع، منثورات من أدب العرب، الأدب العربي بين عرض و نقد، بين التصوف والحياة، في وطن الإمام البخاري، الأصول الثلاثة (یہ بالکل آخری دور کی تصنیف ہے)، عالم اسلام اندیشہ اور امکانات، جغرافیہ جزیرۃ العرب، حج و مقامات حج، رہبر انسانیت، نقوش سیرت، غبار کاروان، دو مہینے امریکہ میں وغیرہ شامل ہیں۔

تصوف وسلوک

آپ تصوف وسلوک میں مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے خلیفہ اور جانشین ہیں۔

وفات

ماہ رمضان (۱۴۴۴ھ) میں آپ اپنے وطن رائے بریلی تشریف لے گئے، وہاں اچانک آپ کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی، جس کے بعد آپ کو علاج کے سلسلے میں لکھنؤ لایا گیا۔ لکھنؤ کے بہترین اطباء کی نگرانی میں آپ کا علاج ہوتا رہا مگر جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آ گیا۔ مولانا سید بلال عبدالحئی حسنی ندوی صاحب کے مطابق ۱۳/اپریل ۲۰۲۳ء کو دوپہر ۱۲:۱۵ بجے آپ نے فرمایا کہ مجھے فوراً ظہر کی نماز پڑھاؤ، نماز جماعت کے ساتھ ادا کی۔ اس کے بعد فوراً بے ہوشی طاری ہوئی۔ ڈیڑھ گھنٹہ بے ہوشی کے بعد ذکر اللہ کرتے ہوئے ۹۳ سال کی عمر میں مالک حقیقی سے جا ملے۔ پہلی نماز جنازہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رات ساڑھے دس بجے ڈاکٹر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی صاحب دامت برکاتہم کی اقتدا میں ادا کی گئی، جس میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی، پورا ندوہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، تل دھرنے کی جگہ بھی نہیں تھی، جب کہ دوسری نماز جنازہ آبائی وطن تکیہ کلاں رائے بریلی میں آپ رحمہ اللہ کے جانشین حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی نے دوسرے دن یعنی ۱۴/اپریل بروز جمعہ صبح آٹھ بجے پڑھائی اور تکیہ کلاں رائے بریلی میں ہی تدفین عمل میں آئی۔

اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہیں وہ صاحب اسرار

☆☆☆

حضرت مولانا سید بلال عبدالحئی حسنی ندوی

عمر رشید
عالیہ ثالثہ شریعہ

حضرت مولانا سید بلال عبدالحئی حسنی ندوی ۳/ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو تکیہ کلاں رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ نجیب الطرفین ہیں، والد کا نام سید محمد الحسنیؒ جونہایت ہی شریف النفس اور معروف انشا پرداز شخصیات میں سے تھے۔ وہ ماہنامہ البعث الاسلامی (عربی) اور تعمیر حیات (اردو) کے مدیر تھے۔ اپنے والد ماجد کے انتقال کے وقت مولانا کی عمر ۲۰ برس تھی۔ انتقال کے بعد سے مولانا کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی انتہا درجے کی محبت وشفقت اور مکمل سرپرستی حاصل رہی۔ ابتدائی تعلیم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی کی نگرانی میں گھر ہی پر حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا جہاں سے ۱۹۸۸ء میں عالمیت کی سند حاصل کی اور اس کے بعد ان ۱۹۹۰ء میں اختصاص فی الحدیث میں فضیلت حاصل کی۔

تدریسی خدمات

۱۹۹۰ء میں ندوہ سے فراغت پانے کے بعد ۱۹۹۱ء میں مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور رائے بریلی میں بہ حیثیت استاذِ حدیث آپ کا تقرر ہوا اور بعد ازاں آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی فکر اسلامی کے موضوع پر درس دیتے رہے۔

دعوتی خدمات

حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ (المتوفی ۱۳ جنوری ۲۰۱۳ء) کے انتقال کے بعد آپ "کل ہند تحریک پیام انسانیت" کے معتمد عمومی کے عہدے پر فائز ہوئے، مولانا موصوف کی انتھک کوشش اور پیہم فکرمندی سے آج یہ تحریک ملک کے طول وعرض میں منظم طریقے پر انسانیت کی خدمت کا کام انجام دے رہی ہے۔ تقریباً ہر صوبہ وشہر میں پیام انسانیت کی ٹیم متحرک اور سرگرم ہے۔

مناصب

۳۰/ جنوری ۲۰۱۳ء میں آل انڈیا انسانیت کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے پھر ۱۱/ مئی ۲۰۲۱ء کو حضرت مولانا سید حمزہ حسنی ندوی کے سانحۂ ارتحال کے بعد ملک کے دینی دانش گاہ کے نائب ناظم مقرر ہوئے۔ اس کے بعد سابق ناظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے انتقال کے بعد ۱۴/ اپریل ۲۰۲۳ء مطابق ۲۲ رمضان المبارک ۱۴۴۴ ہجری کو ندوۃ العلماء کی مجلس نظامت نے مولانا مدظلہ العالی کو ندوۃ العلماء کے اعلیٰ منصب یعنی عہد نظامت کو آپ کے سپرد کیا۔

اس کے علاوہ دیگر مشغولیات جیسے آپ کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی رکنیت حاصل ہے اور مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور رائے بریلی بھی آپ ہی کی زیر نظامت میں ہے۔ اسی طرح آپ دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی کے تحت ایک علمی وتحقیقی ادارہ "مركز الإمام أبي الحسن الندوي" سے شائع ہونے والے "ماہنامہ پیام عرفات" کے مدیر اعلیٰ بھی ہیں۔ اسی طرح ۱۲/ صفر ۱۴۴۵ھ مطابق ۳۰/ اگست ۲۰۲۳ء

کو آپ کو مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند کا رکن منتخب کیا گیا۔ آپ مرکزی حج کمیٹی کے ساتھ چھ سال رکن رہ کر حجاج کرام کی خدمت کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔

تصنیفی خدمات

آپ نے عربی اور اردو میں ایک درجن سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ آپ نے ''آسان معانیٔ قرآن'' نام سے قرآن مجید کا ایک نہایت ہی شستہ اور سلیس اردو میں ترجمہ پیش کیا۔ یہ ترجمہ مذکورہ صفات کی بنا پر بہت ہی مقبول اور ہر دل عزیز ہے اور عوام و خواص کے لیے یکساں مفید بھی ہے۔

فن حدیث میں آپ کی تصنیف "مبادئ وأصول في علم حديث الرسول صلى الله عليه وسلم" کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے، جب کہ ''حدیث کی روشنی'' نامی کتاب بھی آپ ہی کی قلمی کاوش کا نتیجہ ہے۔

سیرت و تاریخ میں: اسوۂ رحمت، اطاعت رسول، غزوات رسول صلی اللہ علیہ وسلم، حقوق رسول ﷺ آپ ہی کی تصانیف ہیں۔ اسی طرح محبت کیا ہے، توحید کیا ہے، اسلامی عقائد قرآن و سنت کی روشنی میں، سوانح مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ آپ ہی کی تحقیق و تدقیق کا نتیجہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ آپ کی نبض شناس دور اندیشی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے ''سماج کی بیماریاں'' اور ''اصلاح معاشرہ سورہ حجرات کی روشنی'' میں نامی کتابیں لکھ کر امت کے حوالے کیا۔

بیعت و خلافت

یوں تو آپ اپنی ابتدائی عمر ہی میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور ان کے دینی اور روحانی سرپرستی آپ کو بھرپور حاصل رہی۔ اس کے علاوہ یہ کہ آپ سید نفیس الحسینی سے مجازِ بیعت ہیں، برصغیر ایشیا میں رائج بالترتیب چاروں سلاسل (چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ اور نقشبندیہ) میں بھی آپ نے اپنے مرشد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی سے اجازت حاصل کی ہے۔ فی الوقت آپ کا فیض جاری و ساری ہے اور امت کا ایک بڑا طبقہ خواہ عوام ہو یا خواص آپ سے فیض یاب ہو رہی ہے اور آپ کے چشمۂ رواں سے سیراب ہو رہی ہے۔

بارگاہ الٰہی میں دست بہ دعا ہوں کہ اللہ آپ کے فیض کو جاری و ساری رکھے اور آپ کا سایہ عاطفت ہم سب پر تادیر قائم رکھے۔ آمین یارب العالمین!

☆☆☆

ندوہ

میرا ایک مدت سے عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جو سیاسی اعتبار سے دیگر ممالک اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، دماغی اعتبار سے ان کی بہت مدد کر سکتے ہیں، کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں ''ندوہ'' علی گڑھ سے زیادہ کار آمد ثابت ہو۔

(علامہ اقبالؒ)

فصل ثانی

نظمائے ندوہ بہ حیثیت ناظم

مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ اور ندوۃ العلماء

عزیز الرحمٰن
عالیہ ثالثہ شریعہ

انیسویں صدی کا یہ ہندوستان ایک ایسے انسان کا منتظر تھا، جس کی نگاہ قدیم وجدید کی مصنوعی سطحی سے بالاتر ہو، اس کی دوراندیشی بصیرت اور حقیقت پسندی نے ایک صدی قبل اس عہد کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ لیا تھا جو عالم اسلام اور ملت اسلامیہ پر مسلط ہوکر اپنی عوام سے محاذ آرائی کرنے والی تھی۔ اس دور کی ان ہی یگانہ شخصیتوں میں ایک مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی ذات بھی تھی۔ مولانا نے جب ہوش سنبھالا وہ انیسویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ تھا۔ یہ وہ عہد تھا جس میں تازہ دم مغرب اور ضعیف و ناتواں مشرق کی باہمی کشمکش اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اس دور میں مولانا نے ایک ایسے عالمگیر اور انقلاب انگیز دینی و تعلیمی تحریک کی بنیاد رکھی، جس کی صدائیں ایک طرف ملک کے چپے چپے میں گونجی تو دوسری طرف یورپ اور امریکہ تک اس کے اثرات محسوس کیے گئے، اور اس کے فکری و دعوتی نقوش وہاں کے علمی و دینی حلقوں میں بھی نمایاں ہوئے۔

۱۸۹۲ء مدرسہ فیض عام کانپور میں اپنے وقت کے جید علماء کی متفقہ رائے سے ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا تاکہ مسلمانوں میں معاشرتی خرابیوں کا مداوا کیا جاسکے، خصوصاً علماء کی باہمی کشمکش، فقہی اختلافات کی شدت، مناظروں کی گرم بازاری اور تکفیر کے رواج کو مٹایا جاسکے اور نئے نئے فتنوں کی طرف سے غفلت کو دور کیا جاسکے۔

چناں چہ مولانا مونگیری دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم اول مقرر ہوئے۔ مولانا مونگیری کی سرپرستی میں تحریک کے ذمہ داروں نے محسوس کیا کہ تحریک ندوہ کے ان مقاصد کے تعارف کے لیے بڑے پیمانے پر وسیع جدوجہد کی ضرورت ہے۔ انہوں نے خاص طور پر اخبارات سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اس میں مضامین بھیجے، دوسری طرف جلسۂ عام کے لیے زمین ہموار کرنے اور علماء سے رابطہ پیدا کرنے کی پوری کوشش کی۔ مولانا مشتاق علی کو اس پر مامور کیا گیا کہ وہ ندوے کے تعارف کے لیے کچھ اہم علاقوں کا دورہ کریں، ندوے کا گویا یہ پہلا وفد تھا جس نے اس سلسلے کا آغاز کیا۔ ان کے ساتھ ارکان کی طرف سے مولاناؒ کی لکھی ہوئی ایک تحریر بھی تھی جس میں ندوے کے قیام کے اغراض ومقاصد تھے:

(۱) تعلیمی نظام کی اصلاح۔

(۲) باہمی نزاع کو دور کرنا۔

مولانا مونگیریؒ کے نمایاں کارناموں میں ندوۃ العلماء کا قیام سرِفہرست ہے۔ انہوں نے گیارہ برس تک اس کی نظامت انجام دی۔ دارالعلوم کی منظوری کے بعد نصاب تعلیم کی تیاری کا مرحلہ آیا، تو ۱۴/جمادی الاولیٰ ۱۳۱۳ھ کو انہوں نے نصاب کا خاکہ پیش کیا۔ یہ نصاب اس انداز سے مرتب کیا گیا کہ جدید علوم کے ساتھ قدیم دینی علوم کو مرکزی حیثیت دی گئی، جو اپنے وقت کا ایک انقلابی قدم تھا۔ اس میں بیس علوم شامل تھے، جن میں منطق، تاریخ، اصول، لغت، عروض، تصوف اور اسرارِ شریعت

وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ندوۃ العلماء کا پہلا نصاب تھا، جس میں بانیانِ ندوہ کی فکری بصیرت نمایاں نظر آتی ہے۔

دارالعلوم کے انتظام میں ہر طالب علم کے لیے الگ حجرہ اور یکساں لباس مقرر تھا۔ ایک مشترکہ دارالطعام، الگ الگ تعلیمی کمروں کا نظم، خوشگوار ماحول، اساتذہ کی رہائش، دارالمحاضرہ، امتحان ہال، شفاخانہ، کتب خانہ اور مسجد کا قیام بھی منصوبے کا حصہ تھا۔ طلبہ کے حجروں کی صفائی، سادہ سامان، منظم اوقاتِ کار، اسلامی لباس، جسمانی ورزش اور طلبہ کی صلاحیت کے مطابق فنونِ صناعیہ کی تعلیم کو بھی خاص اہمیت دی گئی۔

مولانا مونگیریؒ نے میرٹھ کے اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے ابتدائی درجات کے لیے ایک سال کے مصارف کا انتظام پیشگی ہونا چاہیے۔ اس تجویز کی منشی اطہر علی نے تائید کی، جس کے بعد اجلاس میں موجود علماء نے دارالعلوم کے لیے چندہ پیش کیا، اور یوں اسی بابرکت چندے سے دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی۔ بعد ازاں مولانا نے یہ رائے بھی پیش کی کہ علماء کا ایک وفد رؤسائے لکھنؤ کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہاں زمین حاصل کی جائے اور ابتدائی کام کے لیے کسی مناسب مکان کا انتخاب کیا جائے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ کی تائید کے ساتھ یہ تجویز بالاتفاق منظور کر لی گئی۔

جسمانی صحت اور ورزش کی اہمیت:

ایک طرف مولانا کو قدم قدم پر دین داری کا خیال تھا تو دوسری طرف محض علم اور دین داری ان کے نزدیک کافی نہیں۔ جسمانی صحت اور ان کے لیے جو ذرائع ضروری ہوں ان کو اختیار کرنا بھی ان کے نزدیک بے حد ضروری ہے، اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''طلبہ کی ورزش کا بھی بہت خیال رکھیے، قوت اور صحت جسمانی اگر نہ ہوگی تو وہ کیا پڑھیں گے اور محنت کیوں کر کر سکیں گے، اس میں آپ شرم نہ کریں، مشورہ کر کے کوئی ورزش کرائیں۔''

آگے لکھتے ہیں: ''ہر وقت ان پر ایسا دباؤ نہ رہے کہ ان کے دماغ کی شگفتگی جاتی رہے۔ حاصل یہ ہے کہ نہ تو ایسے غیر مہذب ہو جائیں جیسے بعض اسکول کے تعلیم یافتہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی بزرگ کی بات کو نہیں سمجھتے، اور نہ ایسے خائف اور پژمردہ ہو جائیں کہ بشاشت اور فطری رویہ کھو بیٹھیں، بلکہ شرع و تہذیب کے ساتھ ہشاش بشاش رہیں۔''

اردو ادب:

اردو ادب کی اہمیت بھی مولانا کی دوررس نگاہ سے مخفی نہ تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''وہ انشائیں جو اس وقت کی طرزِ تحریر کے موافق لکھی گئی ہیں، انہیں طلبہ کو دیکھنے کا حکم دیجیے۔ اردو عبارت اور مضمون لکھنے کی مشق کرائیے، اگرچہ کوئی اصلاح نہ کرے تو لکھتے لکھتے خود ہی وہ مشاق ہو جائیں گے۔''

علومِ قرآن اور ادب عربی:

دینیات اور قرآن مجید کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابتدائی درجہ میں دینیات کا بہت خیال رکھیے، نصاب میں عمدہ کتابیں ہوں، عقائد کا بیان عمدگی سے بیان کیا جائے مگر اس طرح کہ نئی تعلیم کے مناسب ہو۔ قرآن مجید کی طرف زیادہ توجہ رہے، ایسا ضرور کیجیے کہ ابتدائی درجے کا طالب علم قرآن مجید کے ترجمہ سے عاری نہ رہے۔ قرآن شریف کی تعلیم میں تین امور کا لحاظ بہت ضروری ہے۔

اول: جہاں تک ممکن ہو آیات قرآنی کو نسخ سے بچایا جائے۔

دوم: مطلب بیان کرتے وقت اس کا بہت خیال رہے۔

سوم: قرآن مجید کے الفاظ کا بہت خیال رہے۔"

عربی ادب پر عبور اور تحریر و تقریر کی مشق کا مولانا کو ابتدا سے خیال تھا۔ تجوید کا بھی بڑا اہتمام تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"قرآت کی طرف خاص توجہ رکھیے، طلبہ کو سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرور یاد ہو"۔

آخر میں عنان قلم ہاتھ سے لے کر دل کو دے دی ہے۔ لکھتے ہیں:

یہ کام (ندوۃ العلماء کا) خدا کے فضل سے قائم ہوا اور بہ ظاہر میرے نام لگایا گیا، اب اگرچہ بہت دل چاہتا ہے کہ دل توڑ کر اس کی خدمت کروں اور ندوۃ العلماء کو اور اس کے دار العلوم کو چلا کر دکھا دوں اور اس میں فنا ہو جاؤں، مگر ضعف جسمانی اور قصور ہمت دونوں اس کے مانع ہیں۔

مولانا کو حجاز کے قیام کے دوران ندوے کی جتنی فکر تھی، اس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو مولانا سید عبدالحیؒ کے نام انہوں نے مکہ معظّمہ سے لکھے ہیں اور اس کی جزئیات کا جس اہتمام سے ذکر کرتے ہیں، اس کی ترقی کی جو عملی صورتیں تجویز کرتے ہیں اس سے ان کے اس تعلق کے خاطر پر روشنی پڑتی ہے۔

مولانا ۳/شوال ۱۳۲۱ کو ندوہ کے اور ارکان کے ساتھ مدراس کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اگرچہ مولانا اجلاس مدراس سے کچھ عرصہ پیشتر ہی نظامت سے مستعفی ہو چکے تھے لیکن ندوے سے ان کے تعلق اور محبت میں ذرہ برابر فرق نہ آیا تھا۔ چناں چہ ۸/رجب ۱۳۱۳ کو مجلس انتظامیہ کا چوتھا جلسہ ہوا، جس میں ناظم ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیریؒ نے اپنی علالت سے مجبور ہو کر استعفی پیش کیا۔ جو منظور نہ ہوا۔

استعفیٰ کی منظوری:

مولانا نے پہلے استعفی کی نامنظوری کے بعد مستقل مونگیر میں سکونت اختیار کر لی تھی اور اپنا استعفٰی بھی اخبارات میں شائع کر دیا تھا۔ بالآخر ۲۳/ربیع الثانی ۱۳۲۱ کو مجلس نے استعفٰی کی منظوری دی۔

☆☆☆

"روحانیت و مادیت کے درمیان بہت مناسب اور معتدل توازن قائم کیا گیا ہے، بعض لوگوں کا رجحان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ ہو جاتا ہے، جب کہ صحیح دعوت یہی ہے کہ مادیت میں گھسے بغیر عقل کو دلیل بنائیں اور تصوف سے انحراف کے بغیر دل تک پہنچیں اور کتاب و سنت کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہیں اور ان ہی اوصاف کے حامل ندوی فضلاء ہیں، جو علم کے اشتغال کے ساتھ رسوخ فی العلم کے جوہر سے آراستہ اور اصلاح باطن کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور سیاسی پینتروں سے جس کا مقصد صرف کرسی کا حصول ہے، کوسوں دور ہوتے ہیں۔"

الشيخ علي طنطاوي

(في مسير الحياة: مقدمہ ص:۱۴)

حضرت مولانا مسیح الزماں خان بہ حیثیت ناظم

مشتاق احمد ڈار
عالیہ رابعہ شریعہ

ندوۃُ العلماء محض ایک تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر اصلاحی وفکری تحریک کے طور پر وجود میں آئی، جس کا مقصد بدلتے ہوئے حالات میں زندگی کے مختلف شعبوں میں انقلابی اصلاحات برپا کرنا تھا۔ اسی لیے اس کے نظم ونسق کو بحسن وخوبی چلانے کے لیے ذمہ داران کو مختلف اہم مناصب پر فائز کیا گیا۔ ان میں بالخصوص تین عہدے مرکزی اہمیت کے حامل رہے:

(۱) ناظمِ ندوۃُ العلماء،
(۲) معتمدِ تعلیم،
(۳) مہتمم دارالعلوم ندوۃُ العلماء۔

ندوۃ العلماء کی تاریخ میں وہ روشن ضمیر علماء جو اسے مضبوط بنیاد، عزت ووقار اور روشن فکری سمت فراہم کرنے میں نمایاں رہے، ان میں مولانا مسیح الزماں خانؒ کا نام بھی شرفِ فہرست رکھتا ہے۔ مولاناؒ کا نام دارالعلوم ندوۃُ العلماء کے دوسرے ناظم کی حیثیت کے طور پر سامنے آتا ہے۔

مولانا کا مختصر تعارف:

مولانا مسیح الزماں خانؒ کی ولادت ۱۸۴۰ء میں شاہجہاں پور میں ہوئی۔ آپ کے والد محترم کا نام محمد عمر خانؒ اور جدِ امجد کا نام داراب خان تھا۔ آپ نے اپنی ابتدائی واعلیٰ تعلیم کا بڑا حصہ اپنے نامور بھائی سے حاصل کیا۔ بعد ازاں آپ کو دکن میں اعلیٰ حضرت میر محبوب علی کی تعلیم وتربیت کی نگرانی پر مامور کیا گیا، جس کے باعث آپ کو علمی وانتظامی حلقوں میں خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۸۸۳ء میں آپ دکن سے واپس شاہجہاں پور تشریف لائے اور وہیں اپنی باقی ماندہ زندگی بسر کی، یہاں تک کہ ۱۹۱۰ء میں اس دارِفانی سے رخصت ہوئے۔

ندوۃُ العلماء میں دورِ نظامت

۱۹۰۳ء میں مولانا محمد علی مونگیریؒ کے استعفیٰ کی منظوری کے بعد، مولانا مسیح الزماں خانؒ کو ندوۃُ العلماء کا ناظم مقرر کیا گیا، اور یوں آپ نے اس عظیم علمی وفکری ادارے کی باگ ڈور سنبھالی۔ اگرچہ آپ کا دورِ نظامت زمانی اعتبار سے مختصر تھا، مگر ندوۃ العلماء کی تاریخ میں اسے ایک منفرد اور اہم مقام حاصل ہے۔

اس وقت ندوہ کی تحریک بعض کارکنوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کی زد میں تھی، جو کسی نوخیز ادارے کے لیے نہایت خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ ایسے نازک مرحلے پر مولانا مسیح الزماں خانؒ کا اس ذمہ داری کو قبول کرنا، آپ کے اخلاص، ایثار اور بلند حوصلے کی روشن دلیل ہے۔ آپ کے دو سالہ دورِ نظامت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس عرصے میں ادارے میں نہ کسی قسم کا انتشار ہوا اور نہ ہی اختلافات نے سر اٹھایا، بلکہ خاموشی اور استقامت کے ساتھ متعدد تعمیری و اصلاحی کام انجام پائے۔

چناں چہ آپ کے عہد میں، جنوری ۱۹۰۴ء میں منعقدہ مشہور ''جلسۂ مدراس'' میں، بانیانِ ندوۃ العلماء کے مرتب کردہ اصولوں کی روشنی میں دارالعلوم کا نصابِ تعلیم ترتیب پایا، جس پر

تقریباً تمام اہلِ فکر اور اہلِ علم کا اتفاق رائے حاصل ہوا۔

ندوۃُ العلماء کے دفتر کی عارضی منتقلی:

ناظم منتخب ہونے کے بعد مولانا مسیح الزماں خانؒ کے لیے شاہجہاں پور کی اقامت ترک کرنا ممکن نہ تھا، چناں چہ ندوۃ العلماء کا دفتر عارضی طور پر شاہجہاں پور منتقل کر دیا گیا۔ اس دوران مولانا سید عبدالحئیؒ بھی بہ حیثیت ناظمِ دفتر آپ کے ساتھ شاہجہاں پور میں مقیم رہے۔ اسی دور میں ندوۃ العلماء کا علمی ترجمان رسالہ ''الندوہ'' مولانا شبلیؒ اور مولانا شیروانیؒ کی ادارت میں شاہجہان پور سے شائع ہونا شروع ہوا، جب کہ مولانا سید عبدالحئیؒ اس کے مینیجر تھے۔ دفترِ ندوہ کے مستقل قیام، یعنی مئی ۱۹۰۵ء تک، یہ رسالہ شاہجہاں پور ہی سے نکلتا رہا، بعدازاں لکھنؤ سے شائع ہونے لگا۔ مزید برآں، مولانا مرحوم کے زمانۂ نظامت میں دارالعلوم کے بعض نئے درجات قائم کیے گئے اور تعلیمی سرگرمیاں نہایت پُرسکون اور سازگار ماحول میں جاری رہیں، جو کسی بھی ادارے کے لیے سب سے بڑی کامیابی اور مؤثر کارگزاری تصور کی جاتی ہے۔

دارالعلوم کی شاہجہاں پور منتقلی کا فیصلہ اور اس کی منسوخی

مولانا مسیح الزماں خانؒ اور اہلِ شاہجہاں پور کی ندوۃُ العلماء سے غیر معمولی دل چسپی اور گہرے تعلق کے باعث ایک مرحلے پر دارالعلوم کو بھی شاہجہاں پور منتقل کرنے کا فیصلہ قریب قریب طے پا چکا تھا۔ اس اہم واقعے کا تذکرہ مولانا سید عبدالحی صاحبؒ نے ''رودادِ اجلاسِ دہم'' (ص: ۲۹-۳۰) میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ مولانا سید عبدالحئیؒ لکھتے ہیں:

''جس زمانے میں دارالعلوم موضع بستولی میں تھا اور موسمِ گرما میں مکانات کے ناکافی ہونے کی وجہ سے طلبہ کو فی الجملہ تکلیف پہنچ رہی تھی، تو ارکانِ انتظامیہ نے اس بات پر غور کرنا مناسب سمجھا کہ دارالعلوم کو کسی ایسے مقام پر منتقل کریں جو باعتبار آب و ہوا کے بہتر ہو اور وہاں کے اکثر لوگوں کو دارالعلوم کے ساتھ دلآویزی ہو۔ اس لیے یہ تجویز قرار پائی کہ اگر اہلِ شاہجہاں پور اگر تمام ذمہ داریوں کو انگیز کرنا گوارا فرمائیں تو مدرسہ کو شاہجہاں پور منتقل کر دیا جائے۔ یہ تجویز جلسۂ انتظامیہ منعقدہ ۱۷ر ذی الحجہ ۱۳۲۰ھ، بہ مقام شاہجہاں پور منظور ہوگئی۔

مگر یہ بھی طے ہوا کہ اس مسئلہ پر مکرر غور کرنے کے لیے ارکانِ غیر موجودین جلسۂ انتظامیہ کی خدمت میں بہ طلب آرا بھیجا جائے اور کثرت آرا پر فیصلہ قطعی سمجھا جاوے۔ چناں چہ وقت متعینہ تک جن ارکان کی رائیں موصول ہوئیں، ان کی کثرت رائے پر فیصلہ ہوا کہ مدرسہ شاہجہاں پور کو منتقل کر دیا جائے، لیکن راقم نے خود لکھنؤ جا کر جناب خان بہادر منشی اطہر علی صاحب اور جناب منشی احتشام علی صاحب اور جناب حکیم عبدالعزیز صاحب اور خان بہادر شیخ قادر بخش صاحب رئیس فیض آباد اور نیز دیگر اراکینِ مقامی کی خدمت میں یہ امر ظاہر کیا کہ اگرچہ مدرسہ کا شاہ جہاں پور لے جانا کثرت رائے اراکین پر پاس ہوگیا لیکن جس طرح اہلِ لکھنؤ کو اس کا ملال ہوگا اسی قدر مجھ کو بھی رنج ہے، لہٰذا میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ آپ حضرات اس کی تعلیم و تربیت اور دیگر امور انتظامی میں اصلاح کی ذمہ داری کریں اور اس کے اخراجات کے واسطے جدید چندہ اپنی تجویز سے حاصل کر کے اس کو چلاویں اور جو روپیہ جلسوں میں دیگر تجاویز سے دارالعلوم کے نام کا

آوے، وہ واسطے تعمیر دارالعلوم اور خرید جائیداد مستقل کے جمع رکھا جاوے اور ضرورت تعمیر مذکور اور خرید جائیداد کے کام آئے وگرنہ بہ مجبوری تعمیل تجویز جلسۂ انتظامیہ کی کرنا ہوگی۔ چناں چہ ایک مدت تک اس پر غور و مباحثہ ہوتے رہے اور آخر کار جلسۂ انتظامیہ منعقدہ ۱۷ رشعبان ۱۳۲۱ ہجری نے بہ منظوری خان بہادر منشی اطہر علی صاحب مشیر قانون انجمن ہند تعلقداران اودھ کے یہ طے کیا کہ بہ نگرانی منشی صاحب موصوف ایک سال تک لکھنؤ میں اس کا انتظام رکھا جائے، اسی غرض سے منشی صاحب موصوف کو معتمد مجلس دارالعلوم کا عہدہ قبول کرنے کی تکلیف دی گئی، اور منشی صاحب موصوف نے اس کو خوشی سے قبول فرمایا۔"

اس تجویز پر ایک مدت تک غور و خوض اور بحث و تمحیص جاری رہی، حتیٰ کہ جلسۂ انتظامیہ منعقدہ ۱۷ رشعبان ۱۳۲۱ھ میں، خان بہادر منشی اطہر علی صاحب (مشیر قانون انجمنِ ہند تعلقہ دارانِ اودھ) کی منظوری سے یہ طے پایا کہ ایک سال کے لیے دارالعلوم کا انتظام لکھنؤ ہی میں برقرار رکھا جائے۔ اسی غرض سے منشی صاحب موصوف کو معتمدِ مجلسِ دارالعلوم کا منصب سونپا گیا، جسے انہوں نے خوش دلی سے قبول فرمایا۔

دو سال کی قلیل مدت کے بعد ۱۹۰۵ء میں، مولانا مسیح الزماں خانؒ نے اس عظیم تحریک کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ استعفیٰ کی وجہ بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ تعلقاتِ وطن کے باعث میرے لیے لکھنؤ میں مستقل قیام ممکن نہیں، اس لیے منصبِ نظامت سے علیحدگی اختیار کرنا ناگزیر ہے۔

یوں ایک مخلص، دیانت دار اور درد مند منتظم کا عہد اختتام کو پہنچا وہ عہد جو ندوۃ العلماء کی تاریخ میں سکون اور انتظامی اعتبار سے نہایت منظم دور کی حیثیت رکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا مسیح الزماں خانؒ کا دورِ نظامت ندوۃ العلماء کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ آپ نے نہایت نازک حالات میں ادارے کی ذمہ داری سنبھالی، باہمی اختلافات کا خاتمہ کیا، نصابِ تعلیم کی تدوین کرائی، علمی ترجمان "الندوہ" کا اجرا کیا اور دارالعلوم کے انتظامی ڈھانچے کو استحکام بخشا۔ اگرچہ یہ مدت مختصر تھی، لیکن آپ کی خدمات جامع مخلصانہ اور دیرپا اثرات کی حامل ثابت ہوئیں۔

☆☆☆

"ماضی میں شر کا تسلسل مستقبل میں خیر کے حصول کے لیے مانع ہے۔"

مولانا عبدالعزیز صاحب بھٹکلی ندوی حفظہ اللہ

(کارگزار مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوریؒ کا دورِ نظامت

سجاد حسین ابن محمد حسین
عالیہ ثالثہ شریعہ

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ برصغیر کا ایک ممتاز علمی وفکری ادارہ ہے جس کا قیام امت مسلمہ میں فکری اعتدال مسلکی ہم آہنگی اور قدیم وجدید علوم کے امتزاج کے مقصد سے عمل میں آیا۔ کسی بھی ادارے کی کامیابی، توفیق الٰہی کے بعد مخلص کارکنوں کی مرہون منت ہوتی ہے۔ دعائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی سے اس کی شہرت دوبالا ہوتی ہے۔ ندوۃ العلماء کو روز اول ہی سے ایسے مردان کار ملتے رہے جن کی وجہ سے ایک مستقل نظام تعلیم اور منہج دعوت کو لے کر ابھرنے والی تحریک نے چہار دانگ عالم میں اپنی نیک نامی کے نقوش چھوڑے۔

انتظامی طور پر ندوۃ علماء کے نظم ونسق کو چلانے کے لیے ذمہ داروں کو مخصوص عہدوں اور منصب پر فائز کیا جاتا ہے۔ مرکزی طور پر تین عہدے بڑی اہمیت کے حامل ہیں: ناظم ندوۃ العلماء، معتمد تعلیم اور مہتمم ندوۃ العلماء، نظام کو بہتر طریقے پر انجام دینے میں ان کی ذہانت اور معاملہ فہمی قابل تقلید ہے۔

ندوۃ العلماء کی تاریخ میں جن اکابر علماء نے اسے استحکام، وقار اور فکری سمت عطا کی ہے ان میں مولانا خلیل الرحمن سہارنپوریؒ کا نام بھی نمایاں ہے۔ مولانا خلیل الرحمن سہارنپوریؒ اس علمی وفکری ماحول کے پروردہ تھے جہاں کتاب وسنت کی گہری فہم فقہی بصیرت اور اعتدال مزاجی کو خاص مقام حاصل تھا۔ آپ حدیث، فقہ اور اصول دین میں راسخ العلم تھے اور اکابر سے فیض یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع النظر اور امت کے مجموعی مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ یہی علمی پختگی آپ کے ناظمانہ کردار میں نمایاں نظر آتی ہے۔

حضرت مولانا سہارنپوریؒ کا ندوۃ العلماء سے علمی و فکری تعلق تھا کیوں کہ وہ جدید وقدیم علوم کے امتزاج کے حامی تھے جو کہ ندوۃ العلماء کا نصب العین بھی ہے۔ حضرت مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوریؒ ندوۃ العلماء کی تحریک سے ابتدا ہی سے منسلک تھے، دوسرے اجلاس میں حضرت مولانا رکن مجلس انتظامی منتخب کیے گئے، اور آٹھویں اجلاس عام میں مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی منصب نظامت سے استعفیٰ کے بعد جلسۂ انتظامیہ میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ تا انتخاب ناظم مولانا مسیح الزماں خاں صاحبؒ قائم مقام ناظم رہیں گے۔ اور اسی دور میں حافظ محمد اسماعیل کی تحریک اور مولانا غلام محمد کی تائید سے مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارنپوریؒ بھی نائب ناظم منتخب کیے گئے۔ بعد میں مولانا مسیح الزماں خاں صاحبؒ کے استعفیٰ کے بعد ۱۹۰۵ء میں نائب ناظم مقرر ہوئے اور ۲۰/جولائی ۱۹۱۳ء کے جلسے میں مولانا سہارنپوریؒ مستقل ناظم منتخب بنائے گئے۔ وہ دو ہی سال اس عہدے پر رہے۔ ۱۹۱۵ء مطابق ۱۳۳۴ھ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

ندوۃ العلماء کے دورِ انتشار میں ان کا تذکرہ: ہندوستان کے متعدد بااثر جرائد میں اس طرح آتا رہا کہ ان کی خوبیوں پر پردہ پڑ گیا۔ وہ ایک جامد عالم کی حیثیت سے پیش کیے گئے، اس سے ان کی زندگی کے مؤثر اور روشن پہلو پسِ پردہ رہ گئے۔

۲۰/ذی القعدہ بہ مطابق فروری ۱۹۳۶ء کو حضرت مولانا نے سہارنپور میں وفات پائی۔ مولانا بہت دین دار اور قدیم علماء کی یادگار تھے۔ اللّٰهم اغفرله و ارحمه و ارفع درجاته في العليين.

مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کا دورِ نظامت

مبرور ہلال
عالیہ ثالثہ شریعہ

مولانا سید عبدالحی حسنیؒ، خانوادۂ حسنی کے ایک عظیم اور باوقار فرد تھے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے والد بزرگوار تھے۔

مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کو شروع ہی سے ندوہ سے گہرا تعلق تھا۔ زمانے گزرتے گزرتے ان کے اندر ندوہ سے وابستگی بڑھتی ہی گئی اور آپ اس کے کاموں میں بڑے ذوق وشوق سے حصہ لینے لگے۔ چند ہی سالوں میں ساتھیوں پر آپ کی صلاحیت ظاہر ہوئی اور ۱۳۱۳ ہجری میں آپ کو معاون ناظم کے طور پر منتخب کیا گیا اور آپ کو دفتر ندوہ کا ذمہ دار بنایا گیا۔ اگرچہ اس عہدہ کے لیے بھی تنخواہ مقرر تھی لیکن آپ نے بلا معاوضہ یہ خدمت قبول فرمائی اور اللہ کے لیے ان تمام کاموں کو بحسن خوبی انجام دیتے رہے۔ آپ کی فکر و تخیل اور انتظامی صلاحیت پر بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کو اس قدر اعتماد تھا کہ جب حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو ندوہ کی ذمہ داری آپ ہی کے سپرد کر کے گئے۔

انتشار کے دور میں ندوہ کی قیادت:

آپ طویل عرصے تک معاون ناظم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ اسی دوران ندوۃ العلماء پر ایک نہایت نازک اور کٹھن دور آیا، جب شدید اختلافات نے ادارے کو گھیر لیا اور طلبہ کی ہڑتالوں کے باعث ملک گیر سطح پر بے چینی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اگر اللہ رب العزت کا خاص فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو یہ کہنا مشکل ہے کہ آج ندوہ تاریخ کے کس گوشے میں ہوتا، یا اس کا ذکر بھی باقی رہتا یا نہیں۔ مگر یہ اللہ کا کرم، بانیانِ ندوہ اور مخلصین کی قربانیوں اور دعاؤں کا ثمر تھا کہ ندوہ نہ صرف محفوظ رہا بلکہ قلیل مدت میں پورے ہندوستان اور عالمِ اسلام میں ایک نمایاں، باوقار اور نمائندہ دینی ادارے کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔

آپ نے ناظم ہوتے ہی سب سے پہلے یہ کام انجام دیا کہ آپ نے ''انجمن طلبائے قدیم'' سے ارکان منتخب فرمائے، اس سے ابنائے قدیم اور ارکان ندوہ انتظامیہ میں جو دوری تھی وہ ختم ہوگئی۔ مولانا علی میاں ندوی نے اس کو اس طرح لکھتے ہیں:

> ''ان کے دورِ نظامت میں پہلا خوش آئند کام یہ ہوا کہ انجمن طلبائے قدیم سے ارکان کا انتخاب ہوا، اور دار العلوم کے وہ فضلاء منتخب ہو کر آئے جن سے ندوہ کا نام سارے ملک میں روشن ہوا تھا اور اپنی علمی و عملی صلاحیتوں میں بہت فائق تھے، اور جن کو ندوہ کا حقیقی درد اور اس کی سچی لگن تھی۔ ان ارکان میں سرِ فہرست نام مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کا تھا۔ اس طرح وہ خلیج بھی پٹ گئی جو ابنائے قدیم اور ارکان ندوہ کے درمیان پڑ گئی تھی۔

مولانا سید عبدالحئی صاحبؒ نے سب سے پہلے ان اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کی تجویز پیش کی تھی،

جو دارالعلوم ہی سے فارغ التحصیل ہوئے تھے اور عرصے سے وہاں تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ مولانا نے اس کا اظہار کیا کہ ان کی ناقدری اور حق تلفی نہیں ہونی چاہیے۔" (ایضاً: ۲۰۲)

پھر مزید آگے جا کر لکھتے ہیں:

"مولانا نے مدرسین عربی و دینیات کی تنخواہوں میں اضافہ و ترقی اور بجٹ کی توسیع کی تحریک کی، اور وہ منظور ہوگئی۔ دارالعلوم میں پنج وقت نماز اور جمعہ کے لیے مسجد نہیں تھی تو انہوں مسجد کی تعمیر کی تحریک کی اور بالآخر یہ طے ہوا کہ وہ مسجد نبوی شریف کے نقشہ پر بنائی جائے۔

ان کا دوسرا اقدام یہ تھا کہ ندوہ کو جو رقم گورنمنٹ کی طرف سے ملتی تھی جو اگرچہ بغیر کسی تعلیمی اور انتظامی مداخلت کے حاصل ہوتا تھا، لیکن پھر بھی غیر اسلامی حکومت کا بظاہر ممنون ہونا پڑتا تھا۔ لہٰذا آپ نے اس کو قبول کرنے سے معذرت کردی۔" (ایضاً: ۲۰۳)

ملک کے عمومی حالات:

آپ کے عہدِ نظامت میں ملک شدید انتشار اور بے چینی کے دور سے گزر رہا تھا۔ جنگِ عظیم اوّل کے گہرے اثرات، تحریکات کا زور، جنگی ماحول اور قحط سالی نے پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اسی دوران "تحریکِ خلافت" زور پکڑ گئی اور اس کے اثرات ہر قریے اور ہر ادارے تک پھیل گئے۔ مدارس کا نظم و نسق متاثر ہو چکا تھا، اور اساتذہ و سرپرستوں بل کہ کسی کا بھی طلبہ پر مؤثر اثر باقی نہ رہا تھا۔ ایسے حالات میں طلبہ کو تعلیم کی طرف متوجہ رکھنا ایک نہایت مشکل ذمہ داری بن گیا تھا۔

چناں چہ مولانا علی میاں ندویؒ لکھتے ہیں:

"اس سلسلے میں ان کو جو مشکلات پیش آئیں اور جس طرح انہوں نے اس نازک و دشوار کام کو اس پرآشوب و بلاخیز زمانہ میں (جب ذہن توازن کھو چکے تھے) جس طرح انجام دیا، اس کا اب اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔" (ایضاً: ۲۰۶)

مدت نظامت میں توسیع:

ایسے منتشر اور پُرآشوب حالات کے باوجود مولانا کا دورِ نظامت اللہ کے فضل و کرم سے ترقی اور استحکام کی راہ پر گامزن رہا، اور حسنِ تدبیر کے ساتھ کامیابی سے اپنی منزل کی جانب بڑھتا رہا۔ پھر مارچ ۱۹۲۰ء میں مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کی مدتِ نظامت ختم ہونے والی تھی، لیکن ۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو مجلسِ انتظامیہ نے ارکان کے اصرار پر انہیں اسی منصب پر برقرار رکھا، اور اتفاقِ رائے سے دوبارہ ناظم منتخب کرلیا گیا۔

چند جدید تقررات و اصلاحات:

مولانا سید عبدالحی حسنیؒ ابتدا ہی سے صدر المدرسین اور اساتذہ کے انتخاب کے بارے میں واضح رائے رکھتے تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے دارالعلوم میں اعلیٰ پایے کے علماء اور ماہرینِ فن اساتذہ کو شامل کرنے کی سنجیدہ کوشش کی۔ اور اس سلسلے میں وہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ اور علامہ شبلیؒ کے نقشِ قدم پر گامزن رہے۔ اس لیے جب مفتی عبداللہ ٹونکیؒ کے بعد دارالعلوم میں صدرِ مدرس کا منصب خالی تھا تو اس عہدے کے لیے مولانا سید امیر علی صاحبؒ کا انتخاب کیا، جو حدیث، رجال، فقہ اور اصول کے متبحر عالم اور کثیر التصانیف مصنف تھے۔ وہ ۱۹۱۵ء میں مولانا کی دعوت پر تشریف لائے اور صدرِ مدرسی کے ساتھ اہتمام کی ذمہ داری سنبھال لی۔ ان کے انتقال کے بعد جولائی ۱۹۲۱ء میں آپ کے اصرار پر مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکیؒ کا انتخاب کیا گیا، جو معقول و منقول دونوں علوم میں مہارت رکھتے تھے۔

اسی طرح تجوید کی تدریس کے لیے قاری ابراہیم رشید مکیؒ کا انتخاب کیا، جو اپنے فن کے مسلّمہ استاد تھے اور مکہ مسجد،

(بقیہ صفحہ ۴۱ پر)

مولانا سید نواب علی حسن خان صاحب کا دورِ نظامت

عبدالوحید پالہ
عالیہ رابعہ شریعہ

تحریک ندوۃ العلماء برصغیر ہند و پاک کی ایک عظیم دینی، علمی اور اصلاحی تحریک ہے جو انیسویں صدی کے اواخر میں اس احساس کے تحت وجود میں آئی کہ مسلمانانِ ہند کو ایسے علماء کی ضرورت ہے جو دین کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے تقاضوں سے بھی واقف ہوں۔ اسی تحریک کے نتیجے میں ۱۸۹۸ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء قائم ہوا، جس کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد اسلامی علوم کو جمود سے نکال کر زمانہ کے شعور کے ساتھ جوڑنا تھا۔ اس مقصد میں یہ تحریک کافی حد تک کامیاب ہوئی۔

کسی بھی تحریک یا ادارے کی کامیابی کے لیے اللہ کی توفیق کے بعد اگر کسی چیز کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ مخلص کارکنوں اور ذمہ داروں کی ہیں جو ادارے یا تحریک کی شہرت میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ندوۃ العلماء کو روزِ اول ہی سے توفیق الٰہی کے شامل حال ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے مخلص کارکن و منتظم ملتے رہے جن کے ذریعے سے یہ ادارہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا اور پورے عالم میں اپنے فیض کو پہنچاتا رہا۔

ندوۃ العلماء جو کہ صرف ایک تحریک یا ایک ادارے کے طور پر وجود میں نہیں آیا بلکہ انسانی زندگی میں سوچ و بچار اور اندازِ فکر میں ایک انقلابی اصلاح کی خاطر وجود میں آیا تھا، بہ فضلِ الٰہی اس کے ایک ایک عمل میں بہ درجہ اتم ان عناصر کی جلوہ گری ہوئی۔

ندوۃ العلماء کے منتظمین میں ایک قابل قدر اور قابل تقلید شخصیت حضرت مولانا سید نواب علی حسن خانؒ کی شخصیت ہے۔ آپ کا دورِ نظامت نہایت اہم سمجھا جاتا ہے کیوں کہ اسی زمانے میں ادارے کی انتظامی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔ نواب صاحب امیر الملک نواب سید حسن خان بہادر کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ نے اساتذۂ بھوپال سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا فضل رحمن سے بیعت ہوئے۔ آپ ۱۹۰۱ء میں بھوپال چھوڑ کر لکھنؤ آئے اور تحریک ندوۃ العلماء کے ساتھ جڑ گئے۔ نواب صاحب برصغیر کے ممتاز علماء اور ندوۃ العلماء کے اہم رہنماؤں میں شمار کیے جاتے ہیں، اپ طویل عرصے تک ندوۃ العلماء کے ناظم کے عہدے پر فائض رہے۔ آپ کا شمار ان شخصیات میں ہوتا ہے جن کے ذریعے سے ندوے کو فکری، تعلیمی اور تنظیمی استحکام حاصل ہوا۔

نواب صاحب ندوے کے ان ارکان میں سے ہیں جو بہ روزِ اول تا دمِ آخر پوری دل چسپی، ہمدردی اور خلوص کے ساتھ ندوے سے متعلق رہے۔ ان کے ذریعے سے اس ادارے کو خاص وقار و اعتبار اور حاصل ہوا۔ آپ عرصے تک معتمد تعلیم رہے اور دیگر امور میں بھی اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ حضرت مولانا سید عبدالحیؒ کی وفات کے بعد متفقہ طور پر نظامت کے لیے آپ کا نام تجویز ہوا۔ آپ نے اپنی تمام مصروفیات کے باوجود اس ذمہ داری کو قبول کیا اور اپنی ساری کوششیں ندوے کی تعمیر و ترقی میں صرف کر دیں۔ یہ ان کی وفاداری تھی کہ انہوں نے ہمیشہ ندوہ کے ساتھ تعلق قائم رکھا۔ شروع میں وہ

رکن انتظامی تھے بعد میں حضرت مولانا سید عبد الحی حسنیؒ کی وفات کے بعد ناظم منتخب ہوئے۔

نظامت کے قابل ذکر امور:

ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد اشاعت اسلام کا بھی تھا، جس کی طرف برابر توجہ رہی۔ تحریک خلافت کے سبب ہندو مسلم میں اتحاد ہو گیا تھا، لیکن آریہ سماج کی طرف سے مخالفت شروع ہوگئی اور مسلمانوں کو مرتد کرنے کی تدبیریں شروع کر دیں گئیں، جس کے تدارک کے لیے مسلم جماعتوں کو بھی سامنے آنا پڑا۔ اس مسئلے کے ادراک پر ارکان ندوہ بھی اپنے فرائض محسوس کر رہے تھے لیکن عین وقت حضرت مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کی وفات کی وجہ سے ندوہ کا شیرازہ بکھر گیا جس کی وجہ سے کوئی عملی کاروائی نہ ہو سکی۔ نوابؒ کے ناظم ہونے کے بعد اب چوں کہ خلا پر ہوگئی لہٰذا اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے عملی کاروائی کی گئی۔

آپ کے دور نظامت میں منعقد ہوئے چار اجلاس عام بھی ہیں جو اس تحریک کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں مقبول بنانے میں مددگار ثابت ہوئے۔ آپ نے دور نظامت میں ندوے کے تعلیمی نظام کو منظم کیا اور ندوہ کو ایک فعال مرکز بنایا۔

☆☆☆

(بقیہ: مولانا سید عبدالحی حسنی علیہ الرحمۃ)

حیدرآباد کے خطیب کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے چکے تھے۔ (بحوالہ حیات عبدالحی: ۲۰۷)

اصلاح نصاب کی کوشش: آپ نے اپنے دور میں اصلاحِ نصاب کے لیے ماہرین کی کمیٹی مقرر کی، اساتذہ سے رائے طلب کی اور ان کے تجربات ومشوروں کی روشنی میں نصاب میں مفید اصلاحات وترمیمات کی گئیں، اس کا انتظام کیا گیا کہ گوشوارۂ خواندگی ہر مہینہ ناظم ندوۃ العلماء کے پاس بھیجا جائے اور وہ ماہ بہ ماہ تعلیمی کارکردگی سے واقف رہے۔

اسی طرح ندوۃ العلماء کے ناگپور اجلاس (۱۹۱۸ء) میں یہ تحریک چلائی گئی کہ تاریخ اسلام کو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایف۔اے، بی۔اے اور ایم۔اے کی سطح پر بطور اختیاری مضمون شامل کیا جائے، تاکہ مسلمان اپنی گزشتہ تاریخ سے واقف ہوسکیں۔ (ایضا: ۲۱۲)

پہلے دارالاقامہ کی سنگ بنیاد: اس زمانے تک دارالعلوم میں طلبہ کی رہائش کے لیے کوئی مستقل عمارت (یعنی دارالاقامہ) موجود نہ تھی، چناں چہ طلبہ کو دارالعلوم ہی کی عمارت میں قیام کرنا پڑتا تھا، جس کے باعث انتظامی اور تعلیمی نوعیت کی مختلف مشکلات پیش آتی تھیں اور جگہ کی تنگی بھی ایک مستقل مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ اس لیے مولانا کے دورِ نظامت میں ان ہی کے دستِ مبارک سے ۱۹ اپریل ۱۹۲۱ء کو دارالاقامہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اور اس موقع پر مرمری پتھر پر مولانا کا نام بحیثیتِ ناظم اور ایک عربی تحریر کندہ کی گئی، جو اس اہم تعمیری اقدام کی مستقل یادگار بن گئی۔

مولانا کے معاون رفقا کے کارنامے: مولانا کے دورِ نظامت کا تذکرہ ان کے مخلص رفقائے کار اور معاونین کی خدمات کے اعتراف کے بغیر نامکمل ہے۔ ان حضرات نے مکمل خلوص، بھرپور تعاون اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ مولانا کی قیادت میں ندوۃ العلماء کی خدمت انجام دی۔ باہمی اعتماد، ہم آہنگی اور سکون کے ساتھ کام کرنے کی ایسی مثال ندوہ کی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ ان معاونین میں شیخ محمد احمد رئیس کاکوری اور صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں (فرزند والا جاہ امیر الملک نواب صدیق حسن خاں بہادر رئیس بھوپال) نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ (حیات عبدالحی: ۲۲۱)

مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی بہ حیثیت ناظم

شکیل احمد بٹ
عالیہ ثالثہ شریعہ

حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کا شمار ندوۃ العلماء کے چھٹے ناظم کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اپنے والد ماجد حضرت مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ کی وفات کے بعد ۲۰/دسمبر ۱۹۲۳ء کو رکن انتظامی ندوۃ العلماء کی حیثیت سے منتخب کیے گئے، پھر ۶/اکتوبر ۱۹۲۸ء کو نائب ناظم ندوۃ العلماء کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۹/جون ۱۹۳۱ء کے جلسۂ انتظامی میں مولانا نواب سید علی حسن خانؒ کے استعفیٰ کے بعد آپ نے ندوے کی نظامت کا عہدہ سنبھالا۔

مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کا دور نظامت ندوۃ العلماء کے لیے ہر طرح ایک کامیاب دور نظامت کہا جاسکتا ہے۔ یہ کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے ایک مثالی عہد کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہیں مسلسل ۳۰ سال تک ندوۃ العلماء کے انتظام و انصرام کا موقع ملا جو ان سے پہلے کسی اور ناظم کو نہیں ملا تھا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے ان کے عہد میں نمایاں ترقی کی اور بعض ایسی خوشگوار تبدیلیاں ان کے عہد میں رونما ہوئیں جن کی وجہ سے ان کا دور نظامت ندوۃ العلماء کی تاریخ میں ایک زریں عہد کہا جاسکتا ہے۔

عہدِ نظامت کی چند خصوصیات

علمی ترقی اور اصلاحِ نصاب

ندوۃُ العلماء میں نئے عربی نصابِ تعلیم کی تیاری اور اس کا نفاذ ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کے مبارک عہدِ نظامت کا ایک نمایاں کارنامہ ہے۔ اس اقدام کے ذریعے بانیان وارکانِ ندوۃُ العلماء کا ایک دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور ندوہ کے اولین نصب العین، یعنی اصلاحِ نصاب، کو عملی تکمیل حاصل ہوئی۔ اس نصاب کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تیاری و تشکیل میں خود فرزندانِ ندوۃُ العلماء کی سعی مشکور شامل رہی، جو ان کی علمی و تعلیمی صلاحیت، عربی ذوق کی پاکیزگی اور حسنِ انتخاب کا دلکش مظہر ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے دور نظامت میں عربی زبان و ادب پر خصوصی توجہ دی گئی اور عالم عرب سے خصوصی ربط و تعلق قائم کیا گیا جس کے سبب ندوۃ العلماء کو بیش بہا علمی و مالی اور اخلاقی فائدے حاصل ہوئے۔ عالم عربی میں ندوۃ العلماء کی تحریک کا تعارف ہوا اور ہندوستانی مسلمانوں کا عالم عرب سے قریبی رابطہ قائم ہوا اور اس میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

ڈاکٹر صاحب کے عہدِ نظامت کا ایک نہایت قابلِ ذکر واقعہ، جس نے دارالعلوم کے تعلیمی ماحول اور علمی رجحانات پر گہرا اثر ڈالا، علامہ شیخ تقی الدین الہلالی المراکشیؒ کی آمد اور دارالعلوم میں بطور استادِ اعلیٰ ادبِ عربی ان کا تقرر ہے۔ مختصر مدتِ قیام ہی میں انہوں نے دارالعلوم میں عربی انشا پردازوں اور ادیبوں کی ایک باصلاحیت نسل تیار کردی، جو اس دور کی علمی بصیرت اور تعلیمی وسعت کی روشن دلیل ہے۔

اسی دور میں عربی کا ماہنامہ "الضیاء" نکلا جس نے ممالک عربیہ کے نامور ادیبوں سے بھی دادِ تحسین حاصل کی۔ اسی

وقت سے عربی زبان وادب کی تعلیم کا دارالعلوم میں نیا دور اور نیا طرز شروع ہوا۔

"البعث الإسلامي" اور "الرائد" بھی مولانا کے عہد نظامت ہی میں جاری ہوئے۔ یہ دونوں رسالے حسن ظاہری و باطنی کے لحاظ سے برصغیر ہندو پاک کے سب سے بہتر عربی رسالے کہے جانے کے مستحق ہیں۔

شعبۂ تعمیر و ترقی

ڈاکٹر صاحب کے عہدِ نظامت کی نمایاں خدمات میں یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اسی دور میں دارالعلوم کے احاطے میں مسجد کی تعمیر عمل میں آئی۔ اس عظیم کام میں مولانا مسعود علی صاحب ندوی کی نگرانی، تعاون اور بھرپور انہاک کو بنیادی حیثیت حاصل رہی۔ ڈاکٹر صاحب اور مولانا مسعود علی ندوی دونوں خود شہر شہر جا کر چندہ جمع کرتے تھے۔

اسی عہدِ نظامت میں رواقِ رحمانی کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اس وقت طلبہ کے لیے صرف دو اقامتی عمارتیں موجود تھیں: بڑی جماعت کے طلبہ کے لیے دارالاقامہ، جو علامہ شبلی نعمانیؒ کی نسبت سے رواقِ نعمانی کہلاتا تھا، اور چھوٹی جماعت کے طلبہ کے لیے رواقِ سلیمانی۔

جب طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے سبب یہ دونوں اقامت گاہیں ناکافی ثابت ہوئیں تو ۹ دسمبر ۱۹۵۷ء کے ایک جلسۂ عام میں مولانا سید عبدالعلیؒ نے رواقِ نعمانی کی بالائی منزل پر ایک نئے رواق کی تعمیر کا آغاز فرمایا۔ آپ نے خود اس کا سنگِ بنیاد رکھا اور بانیٔ ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی نسبت سے اس کا نام رواقِ رحمانی تجویز کیا۔

عوامی تعلقات کی مضبوطی:

ڈاکٹر صاحب کے عہدِ نظامت سے قبل ندوۃ العلماء عام مسلمانوں، دینی اداروں اور ممتاز دینی شخصیات سے اس قدر قریب نہ تھا، جتنا ایک دینی ادارے کے لیے مطلوب ہوتا ہے۔ معلومات کی کمی اور بعض غلط فہمیوں کے باعث یہ فاصلہ قائم تھا، تاہم ڈاکٹر صاحب کے دورِ نظامت میں ندوۃ العلماء کے دینی رجحان میں نمایاں استحکام آیا اور دینی، علمی و روحانی شخصیات سے اس کے تعلقات میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ چناں چہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اپنی ایک سالانہ رپورٹ میں اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ:

> "ندوۃ العلماء میں جس نئے عہد کا آغاز ہوا ہے اس کا ایک قابلِ تحسین و موجب شکر پہلو یہ ہے کہ دارالعلوم کا دوسرے دینی حلقوں اور دینی درسگاہوں اور تعلیمی مرکزوں سے قریبی تعلق اور ارتباط پیدا ہو گیا ہے، مختلف اسباب کی بنا پر جس کی ذمہ داری تنہا ندوۃ العلماء پر نہیں ہے دارالعلوم اپنی برادری (مدارس عربیہ) میں ایک ناموس و بیگانہ فرد خاندان تھا، جو ادارہ تمام مسلمانوں میں اتحاد کرانے اور تمام علماء و نمائندگان دین کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا، وہ خود اپنے ماحول میں بیگانہ بن گیا تھا، اور اس کے متعلق بیگانگی اور بعض اوقات جماعتی و اداری تعصّبات کی بنا پر مختلف قسم کی غلط فہمیاں تھیں، اس کی وجہ سے وہ نہ تو اپنی دینی دعوت ان حلقوں میں موثر بنا سکا نہ اپنے ہم جنس اداروں کے اتحاد و تعاون سے فائدہ اٹھا سکا، لیکن الحمدللہ ادھر چند برسوں سے یہ دیواریں بہت مٹ چکی ہیں۔"
>
> (تاریخ ندوہ، دوم: ۴۰۴-۴۰۵)

ڈاکٹر صاحب کے دور نظامت کے متعلق یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ملک کے اندر سیاسی حالات کی تبدیلی اور ملک میں مختلف تحریکات کی وجہ سے ان کے طویل دور نظامت میں

ندوۃ العلماء کا کوئی سالانہ جلسہ نہیں ہوسکا لیکن اس ایک پہلو (جو کہ حالات کی تبدیلی کا نتیجہ تھا) کو چھوڑ کر دار العلوم نے ان کے عہد میں نمایاں ترقی کی جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے مجلس انتظامی میں اپنی رپورٹ میں ڈاکٹر صاحبؒ کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں تعارف کے طور پر کہا تھا کہ: ''میں اس بات کا اظہار کرتا ہوں کہ دار العلوم کا یہ نیا عہد اور اس کا نیا دینی رجحان مولانا موصوف ہی کے خلوص وفکر کا رہین منت ہے اور جب کبھی ندوۃ العلماء کی تاریخ مرتب ہوگی اور اس کی ترقیات و اصلاحات کا سراغ لگایا جائے گا تو ان میں اکثر کا تعلق ان ہی کی ذات اور ان ہی کے دور نظامت سے ثابت ہوگا۔'' (ایضاً: ۴۵۷)

حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ۳۰ سال تک ندوۃ العلماء کی نظامت کے عہدے پر فائز رہے۔ ۷ رمئی ۱۹۶۱ء کو شدید قلبی دورہ پڑا اور روح قفص عنصری سے پرواز کر گئی۔ ان کی وفات کے ساتھ ہی ان کا یہ طویل دور نظامت اپنے اختتام کو پہنچا۔

☆☆☆

ملت کی آخری امید

اس وقت جدید فتنوں، بے حیائی اور بے دینی کو روکنے کے لیے اگر کسی سے کوئی امید ہے تو وہ مدارس کے طبقہ سے ہے۔ لیکن اگر دار العلوم دیوبند، ندوہ و مظاہر جیسے مرکزی اداروں سے نکلنے والے علماء الحاد و دہریت، تشکیک و جدیدیت اور دوسرے بے دین فتنوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور نہ ہی اس کی صلاحیت پیدا کر سکے تو بھلا ایسا کون سا ادارہ ہے جو ان میں ایسی صلاحیت پیدا کر سکے گا جس سے وہ آگے جا کر اپنی قوم و ملت کو ان فتنوں اور خرابیوں سے بچانے کی تیاری کرا سکے؟

مفتی نذیر احمد صاحب کشمیری
رکن تاسیسی آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ
بتاریخ: ۲ ردسمبر ۲۰۲۴ء
بمقام: دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی بہ حیثیت ناظم

اسحاق احمد

عالیہ رابعہ شریعہ

اسلامی تعلیمی اداروں کی تاریخ میں بعض شخصیات ایسی گزری ہیں جنھوں نے علم وفکر کے ساتھ ساتھ نظم وانتظام کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے تمام عالم اسلام کا دھیان اپنی طرف کھینچ لیا اور ملت اسلامیہ کے لیے فخر کا باعث بنے۔ ان ہی عبقری شخصیات میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا نام نمایاں اور درخشاں حیثیت رکھتا ہے۔ آپ محض ایک عظیم مفکر، مصلح اور داعی ہی نہیں تھے بلکہ ایک بصیرت افروز ناظم بھی تھے، جن کی قیادت میں ادارہ دارالعلوم ندوۃ العلماء علمی، اخلاقی اور انتظامی اعتبار سے نئی بلندیوں تک پہنچا۔

ایک نورانی عبقری شخصیت

یہ دنیا حسین یادوں، پاکیزہ خیالات، نیک سیرت اور روشن کردار کی بستی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو سب سے گراں قدر نعمت رکھی ہے نیکی کی نعمت ہے۔ اسی نعمت کا ایک درخشاں نمونہ نیک سیرت خانوادے کے چشم و چراغ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ہیں۔

آپ کی شخصیت جامع الصفات اور جامع الکمالات تھی۔ ابتدا میں آپ کا تعارف ندوۃ العلماء کے ایک تعلیم یافتہ، ندوی فکر عالمِ دین، مفسر اور ادیب کی حیثیت سے ہوا، لیکن وقت نے وہ مرحلہ بھی دکھایا کہ ندوہ آپ کے حوالے سے پہچانا جانے لگا۔ عالمِ اسلام کے علمی نقشے پر ندوۃ العلماء آپ کے ذریعے نمایاں ہو کر سامنے آیا، اور آپ کی ذات سے جو نورانی فضا اور دینی ماحول قائم ہوا، اس کی روشنی آج بھی ندوہ کے ذرّہ ذرّہ میں محسوس کی جا سکتی ہے۔

دورِ نظامت

حضرت مولاناؒ کے برادرِ معظم مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کی وفات کے بعد بالاتفاق نظامت کے لیے انتخاب ہوا۔ یہ ۱۸/ جون ۱۹۶۱ء کی تاریخ تھی۔ پھر ۳۱/ دسمبر ۱۹۹۹ء تک مسلسل آپ نے اس عہدہ کو رونق بخشی۔ (سوانح مفکر اسلام)

آپ جس زمانے میں دارالعلوم کے ناظم منتخب ہوئے، ایک طرف تو وہ زمانہ مالی وسائل کے اعتبار سے بڑی دشواریوں کا تھا؛ مسجد کے علاوہ دارالعلوم میں صرف دو عمارتیں تھیں، تنخواہیں بھی بہت معمولی تھیں۔ دوسری طرف طلبہ میں صحیح دینی فکر وشعور پیدا کرنے، دعوتی مزاج بنانے اور خوابیدہ جذبات وصلاحیتوں کے بیدار کرنے کا مسئلہ تھا۔

حضرتؒ کے مزاج میں استغناء وخودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ اپنے ادارے کے لیے بھی کسی سے کچھ مانگنا گوارہ نہیں کرتے۔ اسی استغناء کی برکت تھی کہ دارالعلوم میں دسیوں نئی عمارتیں بن گئیں، کتب خانہ ''علامہ شبلی نعمانی'' کی پانچ منزلہ عمارت تیار ہوئی، مسجد کی توسیع کی گئی (سوانح مفکر اسلام)

اللہ نے مولانا کے دورِ نظامت میں اس ادارے کو بہت نوازا اور اس کی شہرت اور اہمیت پورے عالم اسلام میں تسلیم کر لی گئی۔ اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہوا، اس کے شعبوں اور شاخوں

کی تعداد خاصی بڑھی، ظاہری ترقی کے ساتھ باطنی ترقی بھی خوب ہوئی۔ اس سب میں ایک طرف مولانا کے معاونین کا بڑا حصہ ہے اور دوسری طرف مولانا کی اس فکرمندی کا کہ ادارہ اپنی خصوصیت اور معنویت اور اپنے مقام و منصب سے ہٹنے نہ پائے بڑا دخل ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً ذمہ داروں کو خطاب فرماتے، نصیحت کرتے، صالح اور بلند کردار کی طرف متوجہ کرتے (مفکر اسلام نمبر)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اپنے عہد نظامت میں ندوۃ العلماء میں کئی بین الاقوامی کانفرنسیں کروائیں، جن میں ۱۹۸۵ء کا ۸۵ سالہ جشن تعلیمی اپنی وسعت کے اعتبار سے سب سے اہم اور کامیاب ترین اجلاس تھا، جس میں دنیا کے مختلف ملکوں کی اہم ترین شخصیات شریک ہوئیں۔ ان شخصیات میں جامعہ از ہر مصر کے شیخ الاز ہر شیخ عبدالحلیم محمود کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے، ان کو مولانا علی میاںؒ نے صدر اجلاس بنایا۔ اس اجلاس کے غیر معمولی اثرات عالم اسلام پر پڑے، ندوے کی شہرت کو عالم اسلام اور عالم عرب میں چار چاند لگے اور ندوے کے اساتذہ وطلبہ کو دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں عزت اور اہمیت دی جانے لگی۔ ندوے میں داخلے کے لیے طلبہ کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۱ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۸۴ء، ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۶ء میں ندوۃ العلماء نے کئی اہم کانفرنسیں بلائیں، جن میں ادب اسلامی کی سمت پیش رفت کے لیے ایک اہم کانفرنس خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ اس کے بعد عالمی رابطہ ادب اسلامی کے فروغ کے لیے ایک عالمی تنظیم رابطہ ادب اسلامی عالمی کا بھی قیام عمل میں آیا، جس کے صدر حضرت مولانا علی میاں ندوی، جنرل سکریٹری مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مقرر ہوئے، نائب صدر ریاض سعودی عربیہ کے پروفیسر اور نامور مصنف وادیب شیخ عبد الرحمن رافت الباشا۔ اور پھر دوسری علمی و ادبی شخصیت شیخ عبد القدوس ابوصالح ہوئے۔ (تعمیر نو کی خصوصی پیشکش)

جدید تعمیرات

۳/نومبر ۱۹۷۵ء کو ندوہ کی لائبریری کی نئی تعمیر ہونے والی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس موقع پر مولانا علی میاں ندویؒ نے عربی میں تقریر کی اور بتایا کہ جس طرح مسجدوں کا نسب مسجد ابراہیم خلیل اللہ اور بیت اللہ سے ملتا ہے، اسی طرح ان مدرسوں اور کتب خانوں کا نسب مسجد نبوی کی درس گاہ اور کتاب اللہ سے ملتا ہے کہ یہ سب اسی نور کی شعاعیں اور کرنیں ہیں اور اسی کی خوشہ چیں اور رہین منت ہے۔ بیان کے بعد شیخ احمد عبد العزیز آل مبارک نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اس کا سنگ بنیاد رکھا اور ان کے ہاتھ دعائے خیر کے لیے اٹھ گئے۔ (روداد چمن)

منشی اطہر علی صاحب کاکوری مرحوم کے نام پر ایک نئے ہاسٹل کی ''رواق اطہر'' کے نام سے ۱۹۷۶ء میں بنیاد رکھی گئی اور اس کی تعمیر عمل میں آئی۔ (کاروان زندگی جلد:۶)

رواق اطہر کے بعد طلبہ کی کثرت اور جدید آمد کی بنا پر ایک نئے ہاسٹل کے اضافہ اور تعمیر کی ضرورت محسوس ہوئی، چناں چہ دار العلوم کے شمالی مغرب کی جانب ایک سہ منزلہ اقامت گاہ کی تعمیر ہوئی اور اس کا نام رواق عبدالحئ تجویز کیا گیا اور ۲۸/اپریل ۱۹۹۶ء کو اس نئے کو دار الاقامہ کا افتتاح ہوا (کاروان زندگی)

عالمی روابط اور علمی وسعت میں اضافہ

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کے عہدِ نظامت میں ندوۃُ العلماء کو غیر معمولی علمی و عالمی وسعت نصیب ہوئی۔ آپ کی خواہش اور ایماء پر متعدد صاحبِ کمال اور صاحبِ فن علما دار العلوم تشریف لائے، جن کی علمی صحبت اور قیام سے اساتذہ اور طلبہ نے بھرپور استفادہ کیا۔ اسی دور میں ندوۃ العلماء کے عالمِ عربی و اسلامی سے تعلقات نہ صرف قائم ہوئے بلکہ مضبوط اور مستحکم بھی ہوئے۔ عرب دنیا کے ممتاز مفکرین، ادباء، محققین اور دانشور ندوہ تشریف لائے، جن کے محاضرات اور

علمی مجالس نے طلبہ کو عربی زبان و بیان سیکھنے کا قیمتی موقع فراہم کیا اور ان کی علمی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔

عالمی کانفرنسیں اور عرب کی ممتاز شخصیات کی آمد

حضرت مولاناؒ کے عہدِ نظامت میں ندوہ میں متعدد عالمی کانفرنسیں منعقد ہوئیں، جن میں عالمِ عربی و اسلامی کے نامور علماء، ادباء اور دانش ور شریک ہوئے۔ عالمی رابطۂ ادبِ اسلامی کی دو بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ اسی طرح فتنۂ قادیانیت اور مسلمانوں کو درپیش دینی، ملی اور فکری مسائل پر بھی عالمی کانفرنسیں ہوئیں، جن میں عرب علماء کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

ندوۃ العلماء تشریف لانے والی ممتاز عرب شخصیات میں امامِ حرم شیخ عبدالعزیز آل الشیخ، شیخ عبدالرحمن السدیس، شیخ محمد بن عبداللہ السبیل، شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، ڈاکٹر حسین الذہبی، شیخ عبدالجلیل عبدہ شلبی، شیخ احمد عبدالعزیز آل مبارک، شیخ عبداللہ العلی المحمود، ڈاکٹر محمد محمود صیام، شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، شیخ حسن حبنکہ میدانی، ڈاکٹر عبداللہ عبدالحسن الترکی، شیخ عبدالفتاح ابو غدہ، شیخ علی الطنطاوی، قاری عبدالباسط عبدالصمد، ڈاکٹر عبدالعزیز الفدا، شیخ صالح الحصین، شیخ عبداللہ العقیل، شیخ ناصر العبودی اور دیگر جلیل القدر علماء و مفکرین شامل ہیں۔

(تعمیرِ نو کی خصوصی پیش کش)

یہ تمام سرگرمیاں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی بصیرت، وسعتِ نظر اور عالمی فکری قیادت کا روشن ثبوت ہیں، جن کے سبب ندوۃ العلماء عالمِ اسلام کے ایک نمایاں اور باوقار علمی مرکز کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔

امام حرم کی ندوہ آمد:

آپؒ کے دورِ نظامت ہی میں ندوۃ العلماء کو سعادت حاصل ہوئی کہ امامِ حرم کی تین مرتبہ آمد ہوئی۔ پہلی بار ۱۹۷۷ء، کو امامِ حرم آئے تھے۔ ان کے استقبال کے لیے پورا لکھنؤ چشم بہ راہ تھا۔ دوسری بار ۱۹۸۶ء میں یہی شیخ محمد السبیل آئے اور پھر تیسری بار ۱۹۹۷ء میں بھی ان کی آمد ہوئی اور ہر بار بے مثال خیر مقدم ہوا۔

حضرت مولانا کے عہدِ نظامت میں حاکم شارقہ شیخ سلطان القاسمی کی آمد بھی ۱۹۸۱ء میں ہوئی اور حضرت مولانا علی میاںؒ نے یہ کہہ کر ان کا استقبال کیا کہ (نعم الأمیر علی باب الفقیر)۔ اللہ جل جلالہ کا خاص فضل تھا کہ ندوۃ العلماء کے پیغام کو ان کے ذریعہ آفاقیت حاصل ہوئی اور زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات میں اس کی افادیت سامنے آئی اور یہ بات واضح ہو کر رہی کہ جیسے جیسے زمانہ آگے جا رہا ہے، ندوۃ کی افادیت روز افزوں بڑھتی جا رہی ہے۔ پورے عالمِ اسلام پر حضرت مولانا نے بانگ دہل یہ باور کرا دیا کہ ندوۃ العلماء کی فکر و دعوت میں عالم اسلام کے مسائل کا حل ہے۔ اور یہ ثابت کرا دیا کہ ندوۃ العلماء کی تحریک جو چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں ۱۳۱۱ھ میں اٹھی تھی، ایک تجدیدی تحریک ہے اور یہ تحریک وقت کے عظیم جہاد کی علمبردار ہے جو فکری جنگ کی قیادت کر رہی ہے۔ (تعمیرِ نو کی خصوصی پیشکش)

غرض یہ کہ مولانا علی میاں ندویؒ کا ندوۃ العلماء کی نظامت سنبھالنے کے بعد ندوہ کو عالم گیر شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی۔ اس کی علمی، تعلیمی، دینی اور روحانی حیثیت سے ترقی ہوئی۔ انہوں نے ندوۃ العلماء کے چپہ چپہ پر اپنے لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔ (مفکرِ اسلام نمبر)

لعمرك ما واری التّراب فِعالهُ
ولکنّما واری ثیابًا و أعْظما

☆☆☆

مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا دور نظامت

وسیم اکرم (بھلیسہ ڈوڈہ)
خصوصی ثالث (الف)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی ذات محتاج تعارف نہیں، ان کی حالات زندگی، ان کے کارنامے اور ان پر مضامین لکھنے والوں کی کمی نہیں، وہ ان کی کوششِ پیہم اور عزیمت والی زندگی پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی باقاعدہ ناظم تو سن ۲۰۰۰ء میں مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ کی وفات کے بعد بنے، اس سے پہلے وہ مہتمم اور نائب ناظم بھی رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ باقاعدہ ناظم نامزد ہونے سے پہلے ہی تقریباً چالیس سال وہ سابق ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا علی میاںؒ کے ساتھ سفر و حضر میں سایہ کی طرح ساتھ رہ کر پس پردہ معاون و معتمد خاص کی حیثیت سے ندوہ کے ہر چھوٹے بڑے کام کو انجام دیتے رہے، اور کبھی اس کا اظہار کیا اور نہ از خود کسی کو محسوس کرانے کی کوشش کی۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کی تعمیر و ترقی میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنیؒ کا جو کردار رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ آپ کے اہتمام اور نظامت میں جو نمایاں تعمیری و توسیعی کام ہوا اور ندوۃ العلماء کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ سب حضرت کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ان کے زمانہ میں طلبہ کی کثرت کی وجہ سے ہاسٹلوں اور درس گاہوں میں جگہ کم پڑ گئی تھی۔ لہٰذا تعمیری و توسیعی منصوبہ پر عمل کرتے ہوئے دار القضاء، كلية اللغة العربية، جدید درس گاہ، کتب خانہ کی چوتھی اور پانچویں منزل، رواق ابوالحسن، رواق سلیمانیہ کی تکمیل، رواق حبیب و رواق عبدالحئی، ڈاکٹر سید عبد العلی شفاخانہ کی تعمیر، مسجد ندوۃ العلماء کی عالیشان مسجد میں اضافہ و تکمیل، اور اس کے علاوہ معہد دار العلوم سکروری میں تعمیرات اور حسن انتظام آپ ہی کے دور کا حسین کارنامہ ہے۔

ندوۃ العلماء کے زیر انتظام معہد سیدنا ابی بکر صدیق مہپت مئو اور مدرسہ مظہر الاسلام بلوچ پورہ میں بھی کئی بڑے تعمیری منصوبے، ہاسٹل، درسگاہ اور مسجد کا کام انجام پذیر ہوا، اور آخر میں رواق مونگیری کی تعمیر آپ کی ترقی پسند طبیعت کی عکاس ہیں۔

تعمیری خدمات

ندوۃ العلماء کی تاریخ میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا دور نظامت ۱۹۹۹ء تا ۲۰۲۳ء ایک سنہرے باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور میں ادارے کی تعلیمی، انتظامی اور تعمیراتی بنیادیں نہ صرف مضبوط ہوئیں بل کہ ایک نئی وسعت اور نئی ترتیب کے ساتھ اپنے کمال تک پہنچیں۔ آپ کی تعمیرات محض اینٹ اور گارے کا مجموعہ نہیں تھیں، بلکہ اعلیٰ فکری ترجیحات اور وسیع النظری کا عملی نمونہ تھیں۔ ذیل میں ان تعمیراتی خدمات کا سال بہ سال جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ابتدائی دور (۱۹۹۹ تا ۲۰۰۲) بنیادی ڈھانچے کی اصلاح:

ناظم بننے کے بعد حضرت مولانا رابع حسنیؒ نے پہلا قدم ادارے کی بنیادی ضرورتوں کی طرف بڑھایا۔ آپ نے ندوۃ العلماء کی پرانی عمارتوں کا جائزہ لیا اور خستہ حال عمارتوں اور

ڈھانچوں کی مرمت اور استحکام پر خصوصی توجہ دی۔ ہاسٹلوں میں صفائی ستھرائی، روشنی اور پانی کی سہولت بہتر بنائی۔ کیمپس میں شجر کاری اور راستوں کی درستگی نے ماحول کو خوشگوار بنایا۔ یہ دور تعمیراتی بیداری اور مستقبل کے بڑے منصوبوں کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کرنے کا زمانہ تھا۔

دوسرا مرحلہ ۲۰۰۳ تا ۲۰۰۵ ہاسٹلوں اور رہائش کی وسعت:

طلبہ کی تعداد بڑھنے کے ساتھ نئے ہاسٹلوں کی تعمیر وقت کی ناگزیر ضرورت بن چکی تھی۔ اس مرحلے میں حضرت مولانا سید رابع حسنیؒ نے جدید طرز کے ہاسٹل بلاک تعمیر کرائے، جن میں ہوادار کمرے، مضبوط ڈھانچہ اور ضروری سہولتیں فراہم کی گئیں۔ اساتذہ اور عملہ کے لیے نئی رہائشی عمارتیں بنائی گئیں۔ غسل خانوں اور وضو خانوں کی بہتری نے طلبہ کو بہتر اور باوقار رہائشی ماحول فراہم کیا۔

تیسرا مرحلہ (۲۰۰۶ تا ۲۰۰۸) تعلیمی عمارتوں کی توسیع:

اس دور کو ندوہ کے تعلیمی شعبے کی تعمیر و ترقی کا اہم سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔ آپ نے نئے کلاس، محاضرہ گاہ، اور تعلیمی بلاک کی تعمیر کی۔ عربی شعبے کے لیے نئے کمروں کا اضافہ کیا گیا۔

لائبریری کی ابتدائی توسیع بھی اسی عرصے میں ہوئی، جس نے بعد کے بڑے منصوبوں کا راستہ ہموار کیا۔

چوتھا مرحلہ (۲۰۰۹ تا ۲۰۱۱) ندوۃ العلماء کی عظیم الشان جامع مسجد کی توسیع و تکمیل:

حضرت ناظم صاحبؒ کے دور کی عظیم ترین تعمیرات میں مسجد کی توسیع و تکمیل سرفہرست ہے۔ اس تعمیر کے ذریعے مسجد کو وسیع اور مضبوط بنایا گیا۔ صحن کی توسیع، نئی چھت، ستونوں کی مضبوطی اور اندرونی آرائش نے مسجد کی روحانیت اور جمال دونوں میں اضافہ کیا۔ یہ تعمیر نہ صرف طلبہ کی بڑھتی تعداد کے لیے ضروری تھی بل کہ ندوہ کے روحانی ماحول کی علامت بھی بن گئی۔

پانچواں مرحلہ (۲۰۱۲ تا ۲۰۱۴) ضروریات طلبہ کے بڑے منصوبے:

اس مرحلہ میں مولانا نے طلباء کی روزمرہ ضروریات پر خاص توجہ دی، باورچی خانہ کچن کی جدید کاری، کھانے کے ہال کی توسیع، پینے کے پانی کے جدید انتظامات، اور کیمپس کی سڑکوں کی مضبوطی وہ کام ہیں جنہوں نے طلبہ اور زائرین کی آمد و رفت کو نہایت آسان اور آرام دہ بنا دیا۔ اس عرصے میں کیمپس کی عمومی ترتیب بھی مزید منظم ہوئی۔

چھٹا مرحلہ (۲۰۱۵ تا ۲۰۱۷) لائبریری اور تحقیقی سہولتوں کا پھیلاؤ:

اس دور میں ندوۃ العلماء کے علمی تشخص کو مضبوط کرنے پر کام ہوا، اور لائبریری میں نئی منزل اور تحقیق کے شعبوں کا اضافہ کیا گیا۔ محققین کے لیے الگ مطالعہ گاہیں بنائی گئیں، مخطوطات سیکشن کو بہتر کیا گیا، اور اسٹڈی میٹریل کے ذخیرے کو منظم کیا گیا۔ اس توسیع نے ندوہ کے علمی مقام کو مزید بلند کیا۔

ساتواں مرحلہ (۲۰۱۸ تا ۲۰۱۹) نئے بلاکوں اور کیمپس کی خوبصورتی:

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے کیمپس کی مجموعی خوبصورتی کو بھی تعمیر کا حصہ سمجھا۔ نئے ہاسٹل بلاکوں، اساتذہ کے رہائشی مکانات، سبز کاری، باغیچوں کی ترتیب، اور راستوں کی تزئین کا اہتمام اسی دور میں کیا گیا۔ اس سے ندوہ ایک جدید، منظم اور دلکش کیمپس کی شکل میں ابھرنے لگا۔

آٹھواں مرحلہ (۲۰۲۰ تا ۲۰۲۳) کووڈ کے دوران تعمیراتی تسلسل:

عالمی وبا کووڈ کے سبب دنیا بھر میں تعمیری سرگرمیاں

رک گئیں، مگر مولاناؒ نے اس مشکل وقت کو مرمت اور بہتری کے لیے استعمال کیا۔ پرانی عمارتوں کی اصلاح، رنگ و روغن، فرشوں کی درستی، ہاسٹلوں کی بھرپور صفائی اور مسجد کی تزئین: اس دور کی نمایاں خدمات ہیں۔ اسی دوران ایک نئے ہاسٹل رواقِ مولانا سید محمد علی مونگیری کی بنیاد ڈال کر اسے چند ہی سالوں میں رہائش کے لیے تیار کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب تعمیری کاموں کا جاری رہنا خود میں بڑی خدمات تھیں۔

نواں مرحلہ (۲۰۲۲ تا ۲۰۲۳) آخری مرحلہ مرمت کی تکمیل ہے:

آپ کے دور کے اختتامی برسوں میں مسجد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے باقی حصوں کی تکمیل، طلبہ کے لیے سہولتوں کی حتمی بہتری، کیمپس کی عمومی ترتیب و تنظیم اور ندوۃ العلماء کی مجموعی عمارتوں کو ایک منظم شکل دینے کا کام انجام پایا۔ یہ تعمیرات آپ کی مستقل مزاجی، دردِدل اور ادارے سے بے مثال محبت کا ثبوت تھیں۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی تعمیرات محض ترقیاتی منصوبے نہیں بل کہ ایک بصیرت افروز دور کا عملی عکس تھیں۔ آپؒ نے ندوہ کو نہ صرف تعمیراتی طور پر وسعت دی بل کہ اس کی علمی و روحانی اور تہذیبی و ثقافتی فضا کو بھی مضبوط کیا۔ آپ کا دور بجا طور پر ندوۃ العلماء کی تاریخ کا ایسا دور ہے جسے تعمیر ندوہ کا سنہرا عہد کہا جاسکتا ہے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، اور بہترین مدبر، حکمت و فراست ایمانی کے حامل، مربی و سرپرست تھے۔ وہ پورے ملک کے عظیم اسلامی رہنما کی حیثیت سے ہمیشہ جانے جاتے رہیں گے۔

☆☆☆

"ہندوستان میں عربی زبان و ادب کی جو بھی، جس شکل میں اور جہاں کہیں بھی کوئی متاع پائی جارہی ہے، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اس کے مخلص مردان حق اور ان ہی کے آفتاب علم و عمل کا پرتو ہے۔"

ڈاکٹر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

مجلۃ النصحیہ حیدرآباد، مفکر اسلام نمبر ۲۰۰۱، ص ۳۰

مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کا دورِ نظامت

محمد انیس الرحمٰن

عالیہ رابعہ شریعہ

علوم وفنون اور فکر و ثقافت کی تاریخ میں کچھ ادارے ایسے ہوتے ہیں جو محض تعلیمی مرکز نہیں بل کہ ایک تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کا شمار بھی ایک ایسے ہی مایہ ناز اداروں میں ہوتا ہے، جس کی بنیاد اخلاص، پختہ عزم اور ایک بلند نصب العین پر رکھی گئی۔ اس ادارے کا سفر محض اتفاقی نہیں، بل کہ ان روشن ضمیر اور صاحبِ بصیرت شخصیات کی محنتوں کا ثمر ہے جنہوں نے اس کو نہ صرف اپنے خونِ جگر سے سینچا بل کہ اس کی آبیاری کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اس کے معماروں نے نہ صرف اس کے تعلیمی وفکری معیار کو بلندیوں تک پہنچایا بل کہ اپنی جدوجہد اور بصیرت سے اس کا پیغام دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیا۔ آج عالم اسلام میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی علمی وفکری استقامت اسی مخلصانہ قیادت اور بے لوث قربانیوں کی مرہونِ منت ہے۔

کسی بھی ادارے کی پائیدار کامیابی بارگاہِ الٰہی کی توفیق ونصرت کے بعد اُن مخلص اور فداکار نفوس کی مرہونِ احسان ہوتی ہے جو اسے اپنے قربانیوں سے زندگی بخشتے ہیں۔ ندوۃ العلماء کو ابتدا ہی سے ایسے مخلص و باصلاحیت قائدین میسر آتے رہے جن کی شبانہ روز محنتوں کے نتیجے میں ایک مضبوط، ہمہ گیر تعلیمی اور دعوتی تحریک وجود میں آئی۔ اس نے عالمِ اسلام کے علمی وفکری اور تحقیقی وتصنیفی میدانوں میں اپنی منفرد شناخت پیش کی اور اپنی اس انفرادیت سے علمی عظمت کا لوہا منوالیا۔

ندوۃ العلماء کو ابتدا میں حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ جیسے صاحبِ فکر، روشن ضمیر اور صاحبِ بصیرت عالمِ ربانی کی قیادت میسر آئی۔ مولانا مونگیریؒ سے لے کر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ تک جن بلند ہمت، مخلص اور جاں نثار شخصیات نے ندوہ کی نظامت کی ذمہ داری سنبھالی، وہ اپنی مثال آپ تھیں۔ ان حضرات نے نہایت نازک اور حساس حالات میں اخلاص، حکمت، صبر اور استقامت کے ساتھ ندوہ کے سفینے کو طوفانی مراحل سے بہ حفاظت گزارا اور اسے سرخروئی کے ساحل تک پہنچایا۔ آج اسی قافلۂ ندوہ کی قیادت اس کے موجودہ ناظم: حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی دامت برکاتہم کے ہاتھ میں ہے، جو اس عظیم علمی، فکری ودعوتی امانت کو اعتماد اور وقار کے ساتھ آگے بڑھا رہے ہیں۔

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کو ۱۱؍مئی ۲۰۲۱ء کو ندوۃ العلماء کی مجلسِ نظامت نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیے ناظرِ عام منتخب کیا۔ اس منصب پر فائز ہونے کے بعد آپ سابق ناظمِ ندوہ، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے معاون اور معتمد کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے وصال کے بعد ۱۴؍اپریل ۲۰۲۳ء کو ندوۃ العلماء کی مجلسِ عاملہ نے متفقہ طور پر آپ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ناظم منتخب کیا۔ اس طرح ادارے کی قیادت ایک مرتبہ پھر ایک شریف النفس، صاحبِ بصیرت اور بااعتماد شخصیت کے سپرد ہوئی، جن کی ذات سے ایک بار پھر ندوہ کو

فکری استحکام اور انتظامی وقار کی امید بندھی۔

آپ کے دورِ نظامت کے آغاز ہی سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعمیری اور توسیعی سرگرمیوں نے تیز رفتاری اختیار کر لی۔ پرانی اور بوسیدہ عمارتوں کی از سرِ نو مرمت، مضبوطی اور روغن سازی کے ساتھ ساتھ طلبہ کے لیے بنیادی سہولیات کی فراہمی کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ اسی طرح ادارے کے اندرونی راستوں کی پختگی اور درستی پر بھی مسلسل توجہ دی جا رہی ہے۔ مجموعی تزئین و آرائش کے لیے مستقل ملازمین مقرر کیے گئے ہیں، جو ندوہ کے احاطے اور باغیچوں کی سبزہ کاری، صفائی اور حسنِ ترتیب کو سال بھر برقرار رکھنے میں مصروف رہتے ہیں۔

اگر حضرت ناظم صاحب (دامت برکاتہم) کے اس مختصر دورِ نظامت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیے انجام دی گئی خدمات کو اختصار کے ساتھ مرتب کیا جائے، تو وہ کچھ اس طرح نکات کی صورت میں قلم بند ہو سکتی ہیں:

(۱) داخلہ اور تجدیدِ داخلہ کے نظام میں نمایاں سہولت:

قدیم اور جدید طلبہ کے داخلہ اور تجدیدِ داخلہ کے عمل کو پہلے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ سہل اور منظم بنا دیا گیا۔ اس سے قبل طلبہ کو شدید گرمی میں کئی کئی گھنٹے قطاروں میں کھڑا رہنا پڑتا تھا، جو نہایت مشقت طلب مرحلہ تھا۔ مگر مولانا کی نظامت کے بعد اس پورے نظام کو ڈیجیٹل شکل دے دی گئی۔ اب طلبہ کو گھر بیٹھے آن لائن فارم پُر کرنے کی سہولت حاصل ہو گئی ہے، اور اس کے بعد دارالعلوم میں صرف ایک کاؤنٹر پر حاضری دے کر داخلہ یا تجدیدِ داخلہ کی تمام کارروائی مکمل ہو جاتی ہے۔ اس عملی اصلاح کے نتیجے میں نہ صرف طلبہ کو طویل انتظار اور جسمانی مشقت سے نجات ملی، بلکہ پورے نظام میں مزید شفافیت اور تیز رفتاری آ گئی۔

(۲) کتب خانہ شبلی کی ڈیجیٹلائزیشن اور سہل رسائی:

دارالعلوم کا عظیم علمی اثاثہ؛ کتب خانہ "علامہ شبلی نعمانی" کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈیجیٹل شکل دینے کا اہم اقدام کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے ایک مستقل اور جامع ویب سائٹ تیار کی گئی، جس کے ذریعے کتب خانے میں موجود تمام کتابوں تک آسان رسائی ممکن بنائی گئی۔ اس سہولت کو مزید مؤثر بنانے کے لیے کیو آر کوڈ (QR code) بھی متعارف کرایا گیا، جسے اسکین کرتے ہی کتب خانے کے مکمل کتابی ذخیرے کی تفصیلات سامنے آ جاتی ہیں، اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مطلوبہ کتاب دستیاب ہے یا نہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ نادر اور نایاب کتابوں کے تحفظ اور استفادے کے لیے ایک معیاری انتظام قائم کیا گیا، جس کے تحت لائبریری کی کسی بھی کتاب کا پی ڈی ایف مطالبے پر تیار کر کے فراہم کیا جاتا ہے۔ نہایت مناسب اور کم لاگت پر نایاب کتابوں کے پی ڈی ایف یا فوٹو کاپی حاصل کرنے کی سہولت نے طلبہ، ریسرچ اسکالروں اور محققین کے لیے علمی استفادے کے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔

(۳) شعبۂ اختصاص کی مضبوطی اور طلبہ کے لیے بہتر سہولیات:

شعبۂ اختصاص کو سابقہ صورتِ حال کے مقابلے میں زیادہ مضبوط، منظم اور نمایاں حیثیت دی گئی۔ اختصاص کے درجات کو اے سی اور جدید سہولیات سے آراستہ کیا گیا، تاکہ طلبہ کو یکسوئی کے ساتھ بیٹھ کر اپنے تحقیقی مقالات کی تیاری اور مطالعہ کے لیے موزوں اور سازگار ماحول میسر آ سکے۔

مزید یہ کہ اس شعبے میں داخلے کے لیے نشستوں کی تعداد محدود کر دی گئی اور میرٹ سسٹم کو نافذ کیا گیا۔ محدود نشستوں پر میرٹ (لیاقت و اہلیت) کی بنیاد پر داخلہ دیے جانے سے نہ صرف غیر ضروری بھیڑ میں نمایاں کمی آئی، بلکہ شعبۂ اختصاص کے علمی معیار، اہمیت اور تحقیقی سطح میں بھی خاطر خواہ مضبوطی پیدا ہوئی۔

(۴) انعامی و اعزازی تقریب کا انعقاد:

طلبہ میں علمی شوق، محنت اور نظم و ضبط کو فروغ دینے کے

لیے دارالعلوم میں باقاعدہ انعامی واعزازی تقریبات کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ان تقریبات کا مقصد ان طلبہ کی حوصلہ افزائی کرنا ہے جو اپنے درجوں میں یا پورے دارالعلوم میں امتیازی نمبرات کے ساتھ اول آتے ہیں۔ اسی طرح پورے تعلیمی سال کے دوران سو فیصد حاضری کو برقرار رکھنے والے طلبہ کو بھی دارالعلوم کی طرف سے انعام سے نوازا جانے لگا۔ اس مستقل انعامی تقریب کے موقع پر ایسے نمایاں طلبہ کو دارالعلوم کی جانب سے قابلِ قدر انعامات سے نوازا جاتا ہے، تاکہ دیگر طلبہ بھی محنت، یکسوئی اور درجہ کی پابندی کو اپنا شعار بنائیں اور تعلیمی میدان میں بہتر کارکردگی کے لیے کوشاں رہیں۔

(۵) جدید عنوانات پر انعامی مسابقاتی مناقشے:

طلبہ میں فکری پختگی، اظہارِ خیال اور قوتِ استدلال کو فروغ دینے کے لیے ''علامہ حیدر حسن خان ٹونکی ہال'' میں جدید اور عصری عنوانات پر سالانہ انعامی مسابقاتی مناقشوں کا انعقاد کیا جانے لگا۔ ان مناقشوں میں تجربہ کار اساتذہ کی نگرانی میں طلبہ کو ٹیموں کی صورت میں تقسیم کیا جاتا ہے، جہاں وہ مختلف جدید موضوعات پر منظم اور بامقصد مباحث میں حصہ لیتے ہیں۔

ان مسابقاتی مناقشوں کے دوران طلبہ بھرپور تیاری اور اعتماد کے ساتھ اپنے دلائل پیش کرتے ہیں اور اس طرح علمی گفتگو، منطقی استدلال اور فکری صلاحیتوں کے جوہر نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

(۶) امتحانی نتائج اور سال کی جملہ تعطیلات کی آن لائن فراہمی:

دارالعلوم کے انتظامی نظام کو حتی المقدور ڈیجیٹل شکل دے دی گئی ہے۔ اس کے تحت دارالعلوم کی جانب سے جاری ہونے والے تمام ضروری اعلانات اور سالانہ امتحانات کے نتائج اب ویب سائٹ کے ذریعے طلبہ کو گھر بیٹھے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اس سہولت کے بعد طلبہ کو نتائج یا اعلانات معلوم کرنے کے لیے کسی قسم کی مشقت یا بار بار دفتر کے چکر لگانے کی ضرورت باقی نہیں رہی، بلکہ تمام معلومات دارالعلوم کی ویب سائٹ پر محض چند کلک سے حاصل ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح تعلیمی سال کے آغاز ہی میں پورے سال کی تمام تعطیلات کا باقاعدہ اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اس بروقت اطلاع سے طلبہ کو اپنے اسفار کی پیشگی منصوبہ بندی میں آسانی ہوتی ہے، بالخصوص ٹرین ٹکٹوں کی ریزرویشن بروقت ممکن ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں کنفرم ٹکٹ حاصل کرنے میں نمایاں سہولت میسر آتی ہے۔

(۷) اسفار اور بیرونی رابطے:

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی عالمی سطح پر ترجمانی اور پیغام رسائی کے لیے ناظم صاحب نے مختصر مدت میں متعدد بیرونِ ملک اسفار کیے، جن میں قطر، جنوبی افریقہ اور امریکہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان اسفار کے دوران آپ نے نہ صرف ندوہ کے علمی و فکری پیغام کو مؤثر انداز میں پیش کیا بلکہ بیرونِ ممالک میں مقیم ابنائے ندوہ کو منظم اور باہم مربوط کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ یوں آپ کی قیادت میں ندوہ کی ترجمانی نہ صرف سرحدوں سے آگے برقرار رہی بلکہ ادارے کے عالمی روابط کو نئی مضبوطی حاصل ہوئی۔

(۸) عربی بول چال کے لیے ایک نئے شعبہ کا قیام:

طلبہ میں عربی زبان کی مہارت اور رواں بول چال کو فروغ دینے کے مقصد سے کلیۃ اللغۃ العربیۃ کے تحت ''تحدّث باللغة العربية'' کے عنوان سے ایک مستقل شعبہ قائم کیا گیا۔ اس شعبے میں دارالعلوم کے تجربہ کار اساتذہ طلبہ کی لسانی استعداد اور درجۂ لیاقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مناسب سطح کی عربی کلاسوں میں داخلہ دیتے ہیں۔

بعد ازاں طلبہ کو عربی بول چال، مکالمے اور عملی مشقوں کے ذریعے زبان پر گرفت حاصل کرائی جاتی ہے، تاکہ وہ محض

کتابی علم تک محدود نہ رہیں بلکہ روزمرہ گفتگو اور اظہارِ خیال میں بھی عربی زبان کو اعتماد اور روانی کے ساتھ استعمال کر سکیں۔

(۹) ندوہ کمپیوٹر سینٹر اور انگلش اسپیکنگ سینٹر کا قیام

طلبہ کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کے لیے کمپیوٹر کی بنیادی اور اعلیٰ تعلیم کے مقصد سے ''ندوہ کمپیوٹر سینٹر'' قائم کیا گیا اور اس سلسلے میں مجلسِ تحقیقات ونشریات کی عمارت میں ناظم صاحب کے دستِ مبارک سے کمپیوٹر لیب کا افتتاح عمل میں آیا۔ کورس کی تکمیل پر طلبہ کو ڈپلومہ کے سرٹیفکیٹ سے نوازنے کا بھی باقاعدہ انتظام کیا گیا ہے۔

اسی طرح طلبہ میں انگریزی زبان کی مہارت، بالخصوص انگریزی بول چال پر عبور حاصل کرنے کے لیے ''ندوہ انگلش اسپیکنگ سینٹر'' کے نام سے مستقل ایک شعبہ قائم کیا گیا۔ اس شعبے میں تجربہ کار اساتذہ مختلف اوقات میں طلبہ کو گروپ کی صورت میں انگریزی بولنے کی منظم مشقیں کراتے ہیں، جس سے ان کی انگریزی کے مکالمے میں نمایاں بہتری اور روانی پیدا ہو رہی ہے۔ مزید برآں؛ اس شعبے کے تحت سالانہ انگریزی خطابت اور مباحثے (اسپیچ اور ڈیبیٹ) کے پروگرام اور مسابقے منعقد کیے جاتے ہیں، جو طلبہ کے اندر اعتماد، اظہارِ خیال اور زبان دانی کی صلاحیتوں کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

(۱۰) ڈیجیٹل نظام اور حفاظتی اقدامات کے لیے سی سی کیمرے

دارالعلوم میں نظم وضبط اور سہولت کو بہتر بنانے کے لیے جدید ڈیجیٹل سسٹم متعارف کرایا گیا ہے۔ اس کے تحت گیٹ سے باہر جانے کے عمل کو ڈیجیٹل شکل دی گئی۔ اس سسٹم کے ذریعے طلبہ اپنے ہاسٹل کے نگراں کو محض رول نمبر فراہم کر کے آن لائن اجازت نامہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس نظام سے نہ صرف وقت کی بچت ہوتی ہے بلکہ آمد ورفت کا ریکارڈ بھی محفوظ انداز میں مرتب رہتا ہے۔

اسی طرح دارالعلوم کے ہاسٹلوں اور دیگر اہم مقامات پر حفاظت اور نگرانی کے مؤثر انتظام کے لیے سی سی ٹی وی کیمرے نصب کیے گئے، تاکہ ادارہ ہر قسم کی ناگہانی صورتحال اور ناخوشگوار واقعات سے محفوظ رہے۔

مزید برآں، عالیہ رابعہ شریعہ اور تکمیل کے درجات میں وقت کی بچت کے لیے کیمروں کے ذریعے حاضری کا نظام قائم کیا گیا ہے، اور تعلیمی نظم وضبط برقرار رکھنے کے لیے مستقل ملازمین کو نگرانی کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ان اقدامات کے نتیجے میں ادارے کا مجموعی انتظام زیادہ منظم، محفوظ اور مؤثر ہو گیا ہے۔

(۱۱) مسجد میں وسیع اے سی سسٹم کی تنصیب:

دارالعلوم کی جامع مسجد میں نمازیوں کو گرمی کی شدت سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک بڑا اور مؤثر اے سی سسٹم نصب کیا گیا ہے۔ اس سسٹم کے ذریعے پوری مسجد میں معتدل اور خوشگوار درجۂ حرارت برقرار رہتا ہے، جس سے نمازی شدید گرمی کی کوفت سے بچ کر اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ نماز وتلاوت ادا کر سکتے ہیں۔

(۱۲) وسیع پیمانے پر سولر سسٹم کی تنصیب:

بڑھتی ہوئی مہنگائی کے دور میں بجلی کے بھاری اخراجات سے بچاؤ اور وسائل کے مؤثر استعمال کے لیے دارالعلوم کے تمام ہاسٹلوں پر وسیع پیمانے پر سولر سسٹم نصب کیے گئے۔ اس اہم اقدام کے نتیجے میں دارالعلوم کے بجلی کے بلوں میں نمایاں کمی واقع ہوئی اور ادارے کے مالی وسائل پر پڑنے والا بوجھ کافی حد تک کم ہو گیا۔ یہ قدم نہ صرف معاشی بچت کا ذریعہ بنا بلکہ توانائی کے متبادل اور ماحول دوست استعمال کی طرف ایک مثبت اور دور اندیش پیش رفت بھی ثابت ہوا۔

(۱۳) ہاسٹلوں میں پنکھوں کی فراہمی:

طلبہ کی سہولت اور یکساں انتظام کو یقینی بنانے کے لیے

دارالعلوم کی جانب سے تمام ہاسٹلوں کے کمروں میں پنکھے نصب کیے گئے ہیں۔ اس سے قبل طلبہ کو اپنے کمروں میں ذاتی طور پر پنکھے خرید کر لگانے پڑتے تھے، مگر اس نئے انتظام کے بعد وہ اس اضافی مالی مشقت اور خرچ سے آزاد ہو گیے۔ یہ اقدام نہ صرف طلبہ کے لیے سہولت کا باعث بنا ہے بلکہ ہاسٹلوں کے مجموعی بجلی خرچ میں بھی بہتری کا سبب ہوا ہے۔

(۱۴) تمام ہاسٹلوں میں پینے کے صاف پانی کی فراہمی:

طلبہ کی صحت اور سہولت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دارالعلوم کے تمام ہاسٹلوں میں پینے کے صاف اور صحت بخش پانی کا مستقل انتظام کیا گیا۔ ہر ہاسٹل میں علیحدہ طور پر آر او (R.O) فلٹر نصب کیے گئے ہیں اور ان کے ساتھ واٹر کولر بھی فراہم کیے گئے، تاکہ طلبہ کو سال بھر صاف پانی میسر رہے اور گرمیوں کے موسم میں ٹھنڈا پانی بآسانی دستیاب ہو سکے۔

(۱۵) تعمیرات، تزئین و آرائش اور باغیچوں کی خوش اسلوبی:

دارالعلوم کے احاطے کو خوش نما اور دلکش بنانے کے لیے وسیع پیمانے پر تزئین و آرائش اور ازسرِ نو روغن سازی کا اہتمام کیا گیا۔ مختلف مقامات پر موجود پارکوں اور باغیچوں کو پھولوں کی کیاریوں سے آراستہ کیا گیا۔ جس سے پورے کیمپس میں تازگی، ہریالی اور جمالیاتی حسن پیدا ہوا۔ ان پارکوں کی سبزہ زاری اور پھولوں کی کیاریوں کی رونق اور خوبصورتی کو برقرار رکھنے کے لیے مستقل ملازمین کی ڈیوٹی بھی مقرر کی گئیں، جو سال بھر ان کی دیکھ بھال، نگرانی اور ضروری اقدامات انجام دیتے ہیں۔ ان کوششوں کے نتیجے میں دارالعلوم کا مجموعی حسن مزید خوش گوار، پُرسکون اور دلآویز بن گیا ہے۔

(۱۶) مہمان خانہ: جدید سہولیات سے لیس آرام دہ قیام گاہ:

مہمان خانے کی ازسرِ نو مرمت جاری ہے، اسے جدید طرزِ تعمیر اور سہولیات سے آراستہ کیا جا رہا ہے۔ کھڑکیوں اور دروازوں کو تبدیل کیا جا رہا ہے، نیز ہر کمرے کے ساتھ جدید طرز کے استنجا خانے تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ ان اقدامات کا مقصد یہ ہے کہ مہمانوں کو دورانِ قیام آرام، سہولت اور آسائش کی تمام ضروری سہولیات بہم پہنچ سکیں۔

(۱۷) کینٹینوں کی ازسرِ نو تعمیر اور صفائی کا اہتمام:

احاطۂ دارالعلوم میں طلبہ کی سہولت اور صحت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کینٹینوں کی ازسرِ نو تعمیر کا کام جاری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کینٹینوں کو صاف ستھرا اور صحت کے اصولوں کے مطابق رکھنے پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے، جس کی باقاعدہ نگرانی بھی ہوتی ہے۔ ان اقدامات کے ذریعے کینٹینوں کے معیار کو بہتر بنانے اور طلبہ کو صاف، صحت بخش اور موزوں سہولیات فراہم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

(۱۸) اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ:

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے اساتذۂ کرام کی خدمات، تدریسی محنت اور شب و روز کی بے لوث کاوشوں کا عملی اعتراف کرتے ہوئے ان کی تنخواہوں میں غیر معمولی اضافہ کیا گیا۔ یہ اقدام اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ادارہ اپنے اساتذہ کو محض تعلیمی نظام کا حصہ نہیں بلکہ اپنی اساس اور روح سمجھتا ہے۔

اساتذہ کی معاشی آسودگی کو یقینی بنا کر دارالعلوم نے نہ صرف ان کی عزت و وقار میں اضافہ کیا ہے بل کہ انہیں یکسوئی، اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ تدریسی و تحقیقی خدمات انجام دینے کا موقع بھی فراہم کیا ہے۔ بلاشبہ یہ قدم ادارے کی دور اندیشی، قدردانی اور علمی روایت کی پاسداری کا روشن مظہر ہے، جو دارالعلوم کے تعلیمی معیار کو مزید بلند کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

الغرض حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کا دورِ نظامت ندوۃ العلماء کی تاریخ میں تعمیری فکر، انتظامی بصیرت اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ پیش رفت کے

حوالے سے ایک نمایاں باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کے دورِ نظامت کی اس مختصر مدت میں جو اصلاحات، تعلیمی و انتظامی اقدامات، سہولیات کی بہتری، ڈیجیٹل نظام کا نفاذ، تعمیر وتزئین، تعمیری پختگی و درستی، طلبہ و اساتذہ کی فلاح اور عالمی روابط کی مضبوطی سامنے آئے ہیں، وہ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ ندوہ اپنی روشن روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اعتماد کے ساتھ مستقبل کی طرف گامزن ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عظیم ادارے کو مزید ترقی، استحکام اور عالمی سطح پر مؤثر کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور حضرت ناظم صاحب کو اس عظیم امانت کی خدمت میں مزید اخلاص، حکمت اور استقامت نصیب فرمائے۔ آمین!

☆☆☆

ندوۃ العلماء

اصلاح وتجدید کا وہ سرِ مخفی، جس کی جستجو میں تمام مصلحین گذشتہ سرگردان رہے، مگر بہت کم افکار عالیہ تھے، جن کی اس تک رسائی ہوئی، احیائے ملت کا وہ مقصد عالی جس کو سمجھنے والوں نے سمجھا، پر اس کے انجام دینے کی مہلت کسی نے نہ پائی، تحریک دینی کا وہ شروع عظیم جس کو بایں ہمہ سطوت ووسعت سلطان عبدالحمید نہ کر سکا، اور خدیو مصر نے سید جمال الدین سے اس کا وعدہ کیا مگر ہمت ہار دی، اصلاح اسلامی کو وہ مطلوب عزیز جس سے دارالخلافت اسلامی کے جوامع خالی رہے، اور جس کا مجال اصلاح دس برس کی سعی وجستجو کے بعد بھی جامعہ ازہر کے ستونوں کو نصیب نہ ہوا، وہ یوسف گم گشتہ جس کی آرزو تیونس کے جامعہ زیتونہ میں کی گئی، مگر پوری نہ ہوئی، اور جس کو مراکش کے جامعہ ابن خلدون میں پکارا گیا مگر جواب نہ ملا، یعنی وہ کہ نام ور محمد عبدہ ساری عمر اس کے عشق میں رویا (وأبيضت عيناه من الحزن فهو كظيم) مگر اسے پا نہ سکا، اور قاضی القضاۃ ترکستان نے چالیس برس اس کی حسرت میں کاٹے کہ (يا أسفاً على يوسف) مگر محروم رہا، خاک ہند کے چند ہمم عالیہ اور افکارِ صحیحہ کی کوششوں کی بدولت ندوۃ العلماء کے نام سے وجود میں آیا"۔

(مولانا ابوالکلام آزاد)

فصل ثالث

نظمائے ندوہ کی علمی، دینی اور دعوتی خدمات

مولانا مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کا ردّ قادیانیت وعیسائیت

محمد حسان میر
خصوصی ثالث

تاریخ اسلامی میں بعض شخصیات ایسی ہوئی ہیں جو محض ایک دور یا ایک شعبے ہی تک محدود نہیں رہیں، بل کہ انہوں نے اپنے علم وعمل، اخلاص وللّٰہیت اور فکر وکردار کے ذریعے تاریخ کے مختلف گوشوں کو منور وتاباں کر دیا۔ ایسی ہی ہمہ جہت، یکتائے روزگار اور اثر انگیز شخصیت حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی بھی ہے، جنہوں نے علم وعرفان، شریعت وطریقت، دعوت واصلاح اور دفاعِ اسلام جیسے میدانوں میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ آپ ان جلیل القدر اکابر میں شامل ہیں جن کی حیاتِ مستعار دینی بصیرت، روحانی بالیدگی اور ملت اسلامیہ کے تئیں غیرتِ ایمانی اور حمیت دینی کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔

حضرت مولانا مونگیریؒ کا امتیاز یہ ہے کہ آپ نسبی شرافت کے ساتھ فکری رفعت اور عملی عظمت کے بھی جامع تھے، الغرض آپ جامع الکمالات تھے۔ اگر ایک طرف آپ سادات کرام کے اس سلسلۂ زرّیں سے تعلق رکھتے تھے جس نے صدیوں تک امتِ مسلمہ کی رہبری ورہنمائی کی، تو دوسری طرف آپ نے اپنے علم، تصنیفات، تدریس اور دعوتی جدوجہد سے اس شرافت کو زندہ اور متحرک رکھا۔ آپ کا دور وہ دور تھا جب ہندوستان فکری، مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے فتنوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، چہار جانب سے اسلام اور اہلیان اسلام باطل نظریات وافکار کی زد میں تھے اور ہندوستان میں اسلام کو عیسائیت اور قادیانیت جیسے منظم چیلنجوں کا سامنا تھا۔ ایسے نازک حالات میں مولانا مونگیریؒ نے اپنی زبان وقلم اور تنظیم کے ذریعے دین اسلام کا بھرپور دفاع کیا اور باطل نظریات کو ابھرنے نہ دیا۔

مزید برآں، ندوۃ العلماء کے قیام اور اس کے فکری خدوخال کی تشکیل میں آپ کا کردار اسلام کی تعلیمی تاریخ کا ایک اہم ترین باب ہے، اسی طرح تصوف کے میدان میں آپ کی نسبت، تربیت اور اصلاحی خدمات نے لاکھوں دلوں کو راہِ حق پر استوار کیا۔ الغرض آپ کی خدمات اتنی وسیع اور متنوع ہیں کہ ان کا احاطہ ایک مضمون میں ممکن نہیں، البتہ زیرِ نظر مضمون بہ عنوان ”ردِادیانِ باطلہ: عیسائیت وقادیانیت“ میں حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی ان علمی ودینی خدمات کا جامع تعارف پیش کیا جائے گا، جو انہوں نے عیسائیت اور قادیانیت کے رد میں انجام دیں، تاکہ قاری مولانا مونگیری کی ہمہ گیر شخصیت کو ایک جامع اور متوازن تناظر میں سمجھ سکے۔

مولانا مونگیریؒ کی ان خدمات کی قدر وقیمت کا صحیح ادراک اس وقت تک ممکن نہیں ہے، جب تک کہ اس عہد کے مخصوص حالات اور فکری پس منظر کو سامنے نہ رکھا جائے۔ آپ نے جس وقت اصلاح ودفاعِ دین کا بیڑا اٹھایا، وہ برصغیر کی تاریخ کا انتہائی پرفتن اور نازک ترین دور تھا اسی لیے مولانا مونگیریؒ کی جدوجہد کو کماحقہ سمجھنے کے لیے اس عہد کے فتنوں اور سنگین حالات کا جائزہ لینا بھی ناگزیر ہے، تاکہ یہ بھی واضح ہو جائے کہ

آپ نے کن کٹھن اور مشکل حالات میں حق کی شمع کو روشن کیا اور باطل کی یلغار کو روکنے کا کام کیا۔

عہدِ مونگیری اور فتنوں کا ارتقا:

یہ وہ عہد تھا جب برطانوی راج اپنی پوری قوت کے ساتھ ہندوستان میں اپنی جڑیں جما چکا تھا اور ان کی مذہبی عدم مداخلت پالیسی کی آڑ میں عیسائی مشنریوں کو مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کی کھلی چھوٹ ملی ہوئی تھی، یوں کہیے کہ سرکار کی پشت پناہی حاصل تھی۔ عین اسی استعماری سائے میں ''قادیانیت'' کا فتنہ اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ ۱۹۰۰ء کی مردم شماری کے موقع پر جب مرزا غلام احمد نے اپنی جماعت کے لیے مسلمان فرقہ احمدیہ کا نام تجویز کر کے اسے سرکاری سطح پر درج کرانے کی کوشش کی، تو یہ درحقیقت امت مسلمہ کے وجود میں ایک مستقل شگاف ڈالنے کی مذموم سازش تھی، جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہا۔ مرزا نے نہ صرف ہندوستان بل کہ عرب دنیا کو بھی متاثر کرنے کے لیے عربی اخبارات کا سہارا لیا اور قادیان کو ایک متوازی مرکز کے طور پر ابھارنا شروع کر دیا۔ یہ دور محض مذہبی مباحثوں کا دور نہ تھا، بل کہ ایک گہرا فکری محاذ تھا۔ ایک طرف آریہ سماج جیسی تحریکیں ہندوانہ احیاء پسندی کے ساتھ سرگرم عمل تھیں، تو دوسری طرف مغربی تعلیم کے اثر سے ایک ایسا طبقہ پیدا ہو رہا تھا جو مذہب کو ''عقلیت'' کے نام پر بدلنے کا خواہاں تھا۔ قادیانیت نے اسی صورتحال کا فائدہ اٹھایا اور خود کو ایک جدید اور عقلی تحریک کے طور پر پیش کر کے سادہ لوح مسلمانوں کو ورغلانے کی کوشش کی۔ ان کٹھن اور روح فرسا حالات میں، جب عیسائیت کا سیلاب اور قادیانیت کا فتنہ زوروں پر تھا، حضرت مولانا مونگیریؒ ایک ایسی فصیل بن کر کھڑے ہوئے جس نے باطل کی ہر یلغار کا راستہ روک لیا۔ آپ نے بھانپ لیا تھا کہ یہ محض قلمی مباحثے نہیں بل کہ اسلام کی بنیادی اساس یعنی ختمِ نبوت پر حملہ ہے۔ چناں چہ آپ نے اپنی تمام تر توانائیاں اس فتنے کے سد باب کے لیے وقف کر دیں۔

دفاع ختم نبوت:

حضرت مولانا مونگیریؒ کی زندگی کا سب سے روشن اور تابناک پہلو ''فتنۂ قادیانیت'' کا استیصال اور تحفظِ ختمِ نبوت ہے۔ آپ اس فتنے کی سنگینی سے اس وقت واقف ہوئے جب ہندوستان کے فکری مطلع پر یہ بادل ابھی ابھر ہی رہے تھے، آپ کی اس جدوجہد کی بنیاد محض علمی مطالعہ نہیں بل کہ وہ ایمانی و روحانی اشارے بھی تھے جنہوں نے آپ کی زندگی کا رخ یکسر بدل دیا۔ آپ اکثر ذکر فرماتے تھے کہ عالمِ رؤیا میں حضور سرورِ کائنات ﷺ کے دربارِ عالی میں حاضری ہوئی، آپ ﷺ نے نہایت دل سوز لہجے میں ارشاد فرمایا: ''محمد علی! تم وظیفے پڑھنے میں مشغول ہو، اور قادیانی میری ختم نبوت کی تخریب کر رہے ہیں؟ تم ختم نبوت کی حفاظت اور قادیانیت کی تردید کرو!''

اس غیبی تائید اور نبوی ﷺ ہدایت ہی نے مولانا کے قلب و روح میں وہ تڑپ پیدا کی کہ آپ نے فرض نماز اور تہجد کے علاوہ تمام وظائف ترک کر دیے اور دن رات تحفظِ ختمِ نبوت کے لیے وقف ہو گئے۔ آپ کا یہ جملہ تاریخ کے سینے پر نقش ہے کہ ''اتنا لکھو اور اس قدر تقسیم کرو کہ ہر مسلمان جب صبح سو کر اٹھے تو اپنے سرہانے ردِ قادیانیت کی کتاب پائے۔''

آپ کے نزدیک یہ کام وقت کا افضل ترین جہاد تھا۔ یہاں تک کہ آپ کے کاتب، مولوی نظیر احسن صاحب کو آپ یہ کہہ کر تسلی دیتے کہ مسودات کی یہ کتابت ''جہاد بالسیف'' کے برابر اجر رکھتی ہے۔ اسی طرح آپ نے اپنے لاکھوں مریدین کو بھی اسی مشن سے جوڑا اور یہاں تک اعلان فرمایا کہ جو مرید اس کام میں سستی برتے گا، وہ میری بیعت سے خارج سمجھا جائے گا۔ آپ نے قادیانیت کے رد میں سو سے زائد کتب و رسائل

تصنیف کیے، اور ان معرکہ آرا تصنیف نے باطل کے ایوانوں میں لرزہ طاری کر دیا۔

ہندوستان میں عیسائیت: استعماری سرپرستی اور طریقۂ کار

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا، جس عہد میں استعماری قوتیں ہندوستان پر قابض تھیں، عیسائیت محض ایک عقیدہ نہیں بل کہ فاتحین کا مذہب تھی۔ سرکاری مشنریوں کو حاصل حکومتی سرپرستی اور وسائل کی فراوانی نے ان کے کام کو اس قدر وسعت دے دی تھی کہ اس سیلاب کو روکنا بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ اگرچہ عیسائی روایات کے مطابق اس مذہب کی آمد پہلی صدی عیسوی میں سینٹ تھامس کے ذریعے ہوئی اور بعد ازاں سولہویں صدی میں پرتگالیوں کے ساتھ سینٹ فرانسس زیویئر جیسے کیتھولک مشنری یہاں پہنچے، تاہم ہمارے پیشِ نظر اصل موضوع چارٹر ایکٹ ۱۸۱۳ ہے، جس نے مشنریوں کو ہندوستان میں داخلے اور منظم تبلیغ کا باقاعدہ قانونی راستہ فراہم کیا۔ البتہ ہمیں ان مشنریوں کی حکمتِ عملی اور طریقہ کار کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ انہوں نے براہِ راست تبلیغ کے بجائے معاشرتی خدمت اور جدیدیت کا سہارا لیا: انہوں نے ملک میں جدید تعلیمی ڈھانچہ متعارف کرایا اور ایسے نامور اسکول و کالج قائم کیے جو فکری تبدیلی کا مرکز بنے، دور دراز علاقوں میں ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کا جال بچھایا گیا، خصوصاً 'جذام' جیسی مہلک بیماریوں کے علاج میں ان کی خدمات نے عوامی سطح پر انہیں ہمدرد کے طور پر متعارف کرایا، اسی طرح انہوں نے ستی کی رسم، کم سنی کی شادی اور چھوت چھات جیسی سماجی برائیوں کے خلاف مہم جوئی کر کے خود کو انسانی حقوق کے علمبردار کے طور پر پیش کیا۔ مختصر یہ کہ مشنریوں نے معاشرے کے بنیادی ڈھانچے اور نفسیات کو متاثر کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کی مہیا کردہ سہولیات اور فلاحی کاموں سے متاثر ہو کر غریب اور سادہ لوح عوام نہ صرف ان کی جانب مائل ہوئے، بل کہ بڑی تعداد میں حلقہ بہ گوشِ مسیحیت ہونے لگے۔

ردِ عیسائیت میں تصنیفی خدمات اور تحقیقی رنگ:

حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی مجاہدانہ زندگی کا ایک زریں باب وہ معرکہ آرا تصنیفات ہیں جو آپ نے عیسائیت کے تعاقب میں تحریر فرمائیں۔ آپ کی علمی گرفت کا یہ عالم تھا کہ آپ کا مطالعہ بسا اوقات عیسائی مؤرخین اور پادریوں سے بھی زیادہ وسیع اور عمیق ثابت ہوتا تھا۔

مرآۃ الیقین: اعجازِ عیسوی کا دفاع

عیسائیت کے رد میں مولانا کی غالباً پہلی تصنیف ''مرآۃ الیقین'' ہے۔ اس کتاب کا پس منظر نہایت اہم ہے: پادری عماد الدین نے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی شہرہ آفاق کتاب ''اعجازِ عیسوی'' کے رد میں ''تفتیش المسلمین'' لکھی تھی۔ اعجازِ عیسوی وہ کتاب تھی جس کا جواب دینے کی ہمت پادری فنڈر جیسے نامور مناظر بھی نہ کر سکے تھے۔ چالیس برس کی خاموشی کے بعد جب عماد الدین نے اس کی تردید کی کوشش کی، تو حضرت مونگیریؒ نے ''مرآۃ الیقین'' کے ذریعے اس کا ایسا تعاقب کیا کہ باطل کے سارے تار بکھر گئے، اس لیے کہ آپ نے عیسائی علماء کے اپنے اعترافات سے ثابت کیا کہ اناجیل میں تحریف ہو چکی ہے۔ آپ نے تاریخی حوالوں سے ثابت کیا کہ مولانا کیرانویؒ کا ایک ایک لفظ صداقت پر مبنی ہے۔

عیسائی تاریخ پر عبور اور پادریوں کی لاجوابی:

مولانا کا مطالعہ مسیحی تاریخ کے ان مخفی گوشوں تک تھا جہاں خود پادریوں کی نظر نہ پہنچتی۔ جب پادری عماد الدین نے مشہور عالم 'گروٹیس' (Grotius) کی شخصیت کا انکار کیا، تو مولانا

نے چارلس بول اور گریفیکل ڈکشنری جیسے مغربی مآخذ کے حوالے دے کر اس کی پیدائش، وفات اور اس پر لکھی گئی کتب کی تفصیلات پیش کر دیں۔ آپ نے پادری کی جہالت کو بے نقاب کرتے ہوئے ثابت کیا کہ ایک مسلم عالم، مسیحی تاریخ کے معتبر شخصیات سے ان کے اپنے مذہبی پیشواؤں سے زیادہ واقف ہے۔

آئینۂ اسلام: عقلی و شرعی مغالطوں کا ازالہ:

حیدرآباد کے قیام کے دوران (۱۲۹۷ھ) آپ نے ''آئینۂ اسلام'' تصنیف فرمائی، جو منشی صفدر علی کی کتاب ''نیا زمانہ'' کا مدلل جواب تھا۔ منشی صفدر علی نے شریعت کو 'اخلاقی' اور 'رسمی' خانوں میں بانٹ کر یہ مغالطہ دیا تھا کہ اسلام (نعوذ باللہ) ایک ختم شدہ رسمی شریعت کی طرف دعوت دیتا ہے۔ حضرت مونگیریؒ نے اس مفروضے کی دھجیاں اڑاتے ہوئے چند بنیادی سوالات قائم کیے:

کیا حضرت مسیحؑ نے شریعتِ موسوی کو منسوخ کیا تھا؟ (جس کا کوئی ثبوت اناجیل میں نہیں) یعنی اگر اخلاقی شریعت ہی اصل تھی، تو حواریوں اور مقتداؤں کے کلام سے اس کا استناد کہاں ہے؟ آپ نے ثابت کیا کہ اسلام کی شریعت اخلاق اور احکام کا وہ جامع آمیزہ ہے جو انسانی فطرت کے عین مطابق اور ابدی ہے۔

الغرض آپ نے اپنے قلم سے وہ خدمت انجام دی جس کی بدولت آج مسلمان اپنے عقائد پر ڈٹے ہوئے ہیں اور عیسایت ہو یا قادیانیت، ہر محاذ پر اللہ نے آپ سے دینِ اسلام کے تحفظ اور اس کی ترویج و اشاعت کا کام لیا۔ حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی ہمہ جہت شخصیت نے برصغیر کے پرآشوب دور میں اسلام کے لیے وہ کام کیا جو صدیوں تک یاد رکھا جائے گا۔

آپ محض ایک فرد ہی نہیں بل کہ ایک ایسی تحریک تھے جس نے فتنۂ قادیانیت کی سرکوبی کی، عیسائیت کے استعماری سیلاب کو روکا اور 'ندوۃ العلماء' جیسے عظیم ادارے کی صورت میں امت کو ایک فکری مرکز عطا کیا۔

آپ کی جدوجہد کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ نے قلم کو ''تیغِ برہاں'' بنایا اور بیعت و ارشاد کے خانقاہی نظام کو ''میدانِ جہاد'' میں بدل دیا۔ آپ کی بصیرت نے بھانپ لیا کہ دشمن کا وار علم اور عقلیت کے نام پر ہے، لہٰذا آپ نے اسی میدان میں اسے شکستِ فاش دی۔ آج اگر برصغیر کے مسلمانوں کا ایمان سلامت ہے اور تحفظِ ختمِ نبوت کی تحریک زندہ ہے، تو اس میں قطبِ عالم حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے اخلاص، دردمندی اور شبانہ روز محنت کا بڑا حصہ ہے۔ حق کی یہ شمع جو آپ نے روشن کی، ان شاء اللہ تا قیامت باطل کے اندھیروں کا سینہ چاک کرتی رہے گی۔

☆☆☆

مولانا مونگیری اور احسان وسلوک

رضوان منظور
عالیہ رابعہ شریعہ

احسان وسلوک کی تعریف:

جس طرح جسم و جوارح کے اعمال و احکام اور اوامر و نواہی، قرآن و حدیث میں منصوص ہیں اور یہ علم، فقہ ظاہر کہلاتا ہے، ٹھیک اسی طرح، قلب و باطن سے متعلق بھی احکام و اعمال، اوامر و نواہی وارد ہوئے ہیں اور منصوص ہیں، ان کو فقہ باطن اور تصوف یا بالفاظ دیگر، احسان وسلوک سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً ایمان و تصدیق، عقائد حقہ، صبر و شکر، توکل، رضا بالقضاء وغیرہ، یہ مامورات و فضائل ہیں۔ اسی طرح عقائد باطلہ، بے صبری، ناشکری، تکبر و ریا وغیرہ، مناہی اور رزائل کہلاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں فقہ باطن سے متعلق ہیں۔

جس طرح قرآن شریف میں "أقيموا الصّلوة وآتوا الزكوة" موجود ہے، اسی طرح "يأيها الذين آمنوا اصبروا"، "واشكروا لله" بھی وارد ہوا ہے۔ جہاں "إذا قاموا إلى الصّلوة قاموا كسالى" ہے، اس کے ساتھ ہی "يراءون النّاس" بھی موجود ہے۔

غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مطلوب اصلاح باطن ہے۔ کلام اللہ میں اس کو موجب نجات اور اس کی کدورت کو موجب خسران و ہلاکت قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "قد أفلح من زكاها وقد خاب من دساها" (سورۃ الشّمس) (بلاشبہ جس نے نفس کو صاف کرلیا، وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کو میلہ کیا وہ ناکام)

مولانا مونگیری اور اہل حق کی تلاش:

اللہ تعالیٰ جن کو اپنے مقربین میں شامل کرنا چاہتے ہیں، عام طور پر ان کو ابتدا ہی سے ایسے حالات و واقعات سے گزارتے ہیں، جن سے ان کے ذہن کا تصفیہ اور دل کا تزکیہ ہو جاتا ہے، اور ایک طرح سے وہ کم سنی ہی میں ترقی کی سیڑھی پر قدم رکھ دیتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ معاملہ، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے ساتھ بھی ہوا۔ دس بارہ سال ہی کی عمر تھی کہ آپ پر گھر کی ذمہ داریاں پڑیں۔ آپ کو قدرتی طور پر فکر و پریشانی لاحق ہوئی۔ صحیح رہنمائی ہونے پر آپ کا اعتماد ذات باری تعالیٰ پر مزید پختہ ہوگیا اور توکل علی اللہ کی گراں قدر نعمت آپ کو نصیب ہوئی۔

احسان وسلوک دراصل آپ کی زندگی کا وہ روشن وصف ہے، جو آپ کی باقی ماندہ پوری زندگی کو محیط معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے عظیم کام آپ سے لیے، ان میں آپ کی دل سوزی کا، حلاوت ایمانی و تعلق مع اللہ کا، آپ کی دنیائے فانی سے بے رغبتی کا، بڑا عمل دخل ہے۔ آپ کے دیگر کارناموں کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے وجود میں آنے کا ایک خاص وقت تھا اور ان کی انجام دہی میں کسی نہ کسی سبب کو خاص دخل تھا، جو اُس موقع پر سامنے آکر آپ کے کسی کار خیر کا باعث بنا۔ لیکن جہاں تک آپ کے ظاہر کے بجائے باطن کی اصلاح کا، مخلوق سے لو لگانے کے بجائے خالق سے لو لگانے کا وصف ہے، تو یہ آپ کی حیات باسعادت کے ابتدائی مرحلے سے شروع ہو کر آخری ایام تک ساتھ رہا۔

ابتدائی مراحل:

سترہ اٹھارہ برس کی عمر ہی میں آپ کو تقرب الی اللہ کا شوق دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کی بابت، اہل اللہ اور مشائخ سے آپؒ کی ایک خاص مناسبت تھی۔ اسی زمانے میں آپ کی ملاقات ایک بزرگ، حافظ محمد صاحبؒ سے ہوئی، انہوں نے آپ کو اسم ذات کی تعلیم دی، جس کی وجہ سے آپ کے باطن میں حرارت پیدا ہو گئی، دنیا سے بے رغبتی اور عبادت میں سرور محسوس ہونے لگا۔ بعد میں چند اصحاب کے مشورے سے آپ نے یہ شغل ترک کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے مولانا کرامت علی قادریؒ کی مصاحبت اختیار کی (جو سلسلہ قادریہ کے بزرگ تھے اور ابتدا ہی میں فارس سے ہندوستان تشریف لائے تھے)۔ اس سے آپ کو بہت نفع ہوا اور یہ سلسلہ دس مہینے تک چلتا رہا، یہاں تک کہ مولانا کرامت علی قادریؒ انتقال کر گئے۔

اس کے بعد آپ دوسرے مرشد کی تلاش میں تھے کہ فوراً ہی غیب سے اس کا انتظام ہو گیا اور مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادیؒ کی قدم بوسی آپ کو نصیب ہوئی۔ مولانا اس زمانے میں کانپور میں تشریف فرما ہوتے تھے۔ آپ وہیں حاضر خدمت ہوئے۔ مشائخ کا طریقہ کار رہا ہے کہ آنے والے کا نام اور حال احوال پوچھتے تھے۔ آپ سے بھی مولاناؒ نے کچھ اسی طرح کا استفسار کیا کہ وہ کس کی صحبت میں بیٹھے ہیں۔ آپ نے عرض کیا کہ مولانا کرامت علیؒ کی۔ مولانا نے قدرے وقفے سے فرمایا کہ ''بڑے شخص تھے''۔ اس کے بعد آپ وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہے۔ البتہ ابھی بیعت نہیں ہوئے تھے۔

بیعت و خلافت:

اسی اثنا میں ایک مرتبہ بقصد بیعت آپ نے حاضر خدمت ہونا چاہا۔ بالفاظ حضرت مونگیری: ''مجھے یاد آتا ہے کہ دنیاوی غرض بھی اس کے ساتھ تھی....، الحمدللہ کہ وہاں جا کر یہ خیال ہی محو ہو گیا...''۔ بیعت ہو کر مولانا نے آپ کو کچھ عطیہ دیا اور آپ رخصت ہو گئے۔

عالمیت سے فراغت کے بعد مولانا نے آپ کو اجازت وخلافت سے نوازا۔ واقعہ کچھ یوں پیش آیا کہ آپ ایک دفعہ مولانا کے پاس سے رخصت ہوا چاہتے تھے کہ مولانا نے ہاتھ پکڑ کر مسجد کی ایک جانب بٹھا کر فرمایا کہ کوئی بیعت ہونا چاہے تو نقشبندیہ اور قادریہ میں مرید کر لیا کریں۔ آپ نے عرض کیا کہ میں اس کے قابل نہیں، مولانا نے فرمایا کہ ہم جو کہتے ہیں وہ کرو۔ اس طرح سے آپ کو خلافت عطا ہوئی۔

اس واقعے کے بعد یہ بات خود بخود اور اچانک مشہور ہو گئی کہ مولانا مونگیری کو خلافت حاصل ہوئی ہے۔ بعض افراد آپ سے دریافت کرنے لگے تو آپ نے فرمایا کہ حضرت قبلہؒ موجود ہیں، ان سے جا کر دریافت کرو۔ مولانا سے دریافت کیا گیا، تو آپ نے فرمایا:

> ''ہاں! ہم نے اللہ کا نام بتانے کی اجازت دی ہے اور یہ کون سی بڑی بات ہے، ان کی روح ارواح متقدمین میں سے ہے، ایسے لوگ ہر زمانے میں کم ہوتے ہیں''۔ (سیرت حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری)

مونگیر سے تعلق اور وہاں کا قیام:

مولانا کا مونگیر کا سب سے پہلا سفر ۱۳۱۰ھ میں ہوا۔ آپ کے اس سفر کی تاثیر عجیب وغریب تھی، جو لوگوں کو آپ کا گرویدہ بناتی چلی گئی۔ سفر کے دوران ہی ایک ایسی بادِ بہاری چلی کہ ایک بڑی تعداد میں لوگ تائب ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۳۱۳ھ میں مولانا فضل رحمنؒ کی وفات کے بعد نمایاں طور پر آپ کی آمد ورفت اور اصلاح و بیعت کا تعلق مونگیر سے قائم ہوا اور بالآخر ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء کے آخر میں آپ مونگیر ہی میں مقیم ہوئے۔ اس وقت لوگوں کا ایسا رجوع عام ہوا کہ وہاں کی فضا ہی بدل گئی۔ جس علاقے میں تشریف

لے جاتے، وہاں سے فسق وفجور کا جیسے خاتمہ ہوجاتا۔ لوگ خود صالح بننے کے ساتھ ساتھ اصلاح وتبلیغ کا کام کرنے لگے۔

نمایاں اوصاف:

دنیا سے بے رغبتی: دنیا سے بے رغبتی آپ کے طرز زندگی سے نمایاں ہوتی ہے۔ آپ اصحاب ثروت کی دعوت سے پہلوتہی اختیار کرتے تھے، الّا یہ کہ کوئی دینی نفع ہوتا تو قبول فرما لیتے۔ یہی طریقۂ کار آپ کے وعظ وتقریر کے انداز میں جھلکتا ہے۔ عام خطبا کے طرز پر آپ وعظ نہیں کہتے تھے، بل کہ موقع محل کے اعتبار سے شریعت کی بات سامعین کے سامنے رکھتے تھے، جس کا بڑا اثر ان پر پڑتا اور ان کے قلوب کو سیرابی حاصل ہوتی۔

متعدد بار آپ کے سامنے ملازمت قبول کرنے اور کسی عہدہ ومنصب کو سنبھالنے کی پیشکش ہوئی، لیکن آپ نے (یہ سوچ کر کہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی یہ دولت جو دین وایمان کی شکل میں عنایت ہوئی ہے، محدود ہو کر رہ جائے گی) انکار کر دیا اور خلق خدا میں اس دولت کو تقسیم کرنے کو ترجیح دی۔

عشق رسول:

مولانا کی زندگی اسی شوق وسرور کا نمونہ تھی۔ ان کی بڑی آرزو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت تھی۔ آپ بچپن میں گھڑیوں اس تمنا میں روتے رہتے۔ مولانا اپنے مریدین کو چند خاص اشعار بھی تلقین کرتے کہ جمعہ کی شب میں پڑھا کریں۔

اسی نسبت سے مولانا عربوں کا بہت زیادہ پاس ولحاظ رکھتے تھے اور اگر معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ عرب آئے ہیں تو بوقت ضرورت ان کی حاجت کو اپنی حاجت پر ترجیح دیتے ہیں اور ان کی مدد فرماتے۔

نماز سے عشق: مولانا جماعت کا اور وقت کی پابندی کا اس درجہ خیال واہتمام رکھتے کہ ”قرة عيني في الصلاة“ کے معنی سمجھ میں آجاتے۔

حلقۂ طالبین:

مولانا کے مریدین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان کی تعداد یقیناً ہزاروں سے متجاوز تھی۔ یہاں تک کہ مولانا شاہ تجمل حسین بہاریؒ، خلیفہ فضل رحمنؒ ومصنف ”کمالات محمدیہ“ نے اپنی کتاب میں آپ کے مریدین کی تعداد چار لاکھ بتلائی ہے۔

اس حلقے کا دائرہ اندرونی ملک کے علاوہ بیرونی ملک تک وسیع ہے، جس میں حجاز کے علاوہ: زنجبار، ممباسہ، کابل، غزنی، خراسان، روس اور چین کے اصحاب بھی شامل ہیں، جنھوں نے آپ سے استفادہ کیا اور بیعت ہوئے۔

حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ نے بھی آپ کو چاروں سلسلوں کی اجازت دی تھی اور ایک چادر، ایک تسبیح اور ٹوپی بطور خرقے کے آپ کو بھیجی تھی۔

اصول تربیت:

اللہ تعالیٰ کی آپ پر یہ خاص نعمت وعنایت تھی کہ آپ نے سلوک کو کتاب وسنت کے قریب تر رکھا، اور ان ہی دونوں کے علوم ومعارف سے فیض یاب ہوتے اور کرتے چلے گئے۔ آپ کے اصول تربیت اور طریقہ اصلاح وارشاد سے یہ بات متشرح ہوتی ہے۔ ذیل میں ان ہی اصولوں کا مختصر تذکرہ ہے:

(۱) مولانا فرمایا کرتے تھے کہ اصل یہ ہے کہ انسان دیکھے کہ اس میں سنت کی کس قدر اتباع ہے اور خلق خدا کو کس قدر نفع پہنچ رہا ہے، نہ یہ کہ کرامت کا طالب ہو۔ کرامت اصل نہیں۔

(۲) آپ کے انداز تربیت میں جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے، وہ ہے ”محبت واطاعت“ کا حسین سنگم۔ آپ کا یہ منشا تھا کہ ایک طرف طالب کا دل عشق الٰہی میں غرق ہو اور دوسری طرف وہ حدود شریعت سے ذرہ برابر بھی نہ ہٹنے پائے۔ بالفاظ دیگر آپ ضبط محبت اور شرط محبت کے قائل تھے اور خود ان کی زندگی اس بات کا نمونہ تھی۔

(۳) اللہ کے رسول ﷺ کا یہ طریقہ تھا کہ آپ کسی کو براہ راست ٹوکنے کے بجائے، کنایہ سے کام لیتے تھے۔ یہی دستور مولانا نے بھی اپنایا ہوا تھا کہ اشارات وکنایات کو استعمال کرتے تھے۔

(۴) **طلب و ہوس میں فرق:** آپ فرماتے تھے کہ اکثر لوگ بہت جلد بددل ہو جاتے ہیں اور اس کی اصل وجہ جان نہیں پاتے کہ ہوس جلد تھکتی ہے، جلد مایوس ہوتی ہے، لیکن طلب اس سے بالاتر ہے، منزل کی دوری اس میں مزید طاقت پیدا کرتی ہے، بقول شاعر مشرق علامہ اقبال:

شرعِ محبت میں ہے،عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام

(۵) **فرق مراتب:** آپ چاہتے تھے کہ شریعت کی جس چیز کا جو مرتبہ ہے، اس کو اسی مرتبے پر رکھا جائے، آپ ایک موقع پر فرماتے ہیں:

''یہاں زیادہ غور طلب اور ضروری یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص مستحب کو بدعت کہتے اور اس سے انکار کر دے، تو اس کا کیا حکم ہے۔

مستحب کی دو قسمیں ہیں: وہ مستحب جن کا ثبوت جناب رسول اللہ ﷺ کے فعل سے یا خلفائے راشدین کے قول وفعل سے ثابت ہے، اسے کوئی بدعت نہیں کہہ سکتا اور جو کہے وہ غلطی کرتا ہے۔ باقی رہا وہ مستحب جس کا ثبوت صرف اگلے بزرگوں کے قول وفعل سے ہوتا ہے، اسے کوئی بدعت کہے اور اس پر عمل نہ کرے تو اس کی مختلف حالتیں ہیں۔''

(سیرت حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ)

(۶) مولانا لوگوں سے ان کی صفات کی وجہ سے تعلق رکھتے تھے، کہ تعلق محکم اور پائیدار ہوتا ہے، آپ کا یہ ماننا تھا کہ خدا کی کوئی مخلوق نہ عیب سے خالی ہے نہ ہنر سے، لوگ عام طور سے کسی شخص سے تعلقات پیدا کرتے ہیں، اور جب اس کا کوئی عیب ظاہر ہوتا ہے، تو تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ تعلق صفات کا ہو نہ کہ ذات کا۔

(۷) مولانا ایک مکتوب میں توجہ دلاتے ہیں کہ بہت سے لوگ ذکر کرتے ہیں لیکن دوسری طرف ایسے کاموں میں مشغول ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے قلب ذکر کا اثر قبول نہیں کرتا۔ ایسا اکثر تین چیزوں سے ہوتا ہے: کسی گناہ کا ارتکاب، صحبت کی خرابی، مشتبہ مال۔

(۸) آپ ہر مسترشد سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ یہ تعلق اس نوعیت کا تھا کہ ہر شخص کو یہ محسوس ہوتا کہ آپ کو سب سے زیادہ محبت وشفقت اسی سے ہے۔ اس سے طالبین کو استفادہ آسان ہو جاتا۔ چناں چہ اسی کی ایک کڑی مولانا اور آپ کے مسترشدین کے درمیان تحریروں اور خطوط کا وہ سلسلہ ہے، جس کو سیرت نگاروں نے اپنی تصنیفات میں ذکر کیا ہے اور جس سے بہ آسانی یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہ ''تعلق لله في الله'' تھا۔

(۹) آپ رہبانیت کی طرف ادنی میلان سے بھی منع کرتے تھے۔ ایک صاحب نے تجارت و کاروبار سے بے رغبتی کا مولانا سے اظہار کیا۔ مولانا نے لکھا کہ جو لذت و کیفیت ذکر میں ہے، وہ تجارت وغیرہ میں نہیں، البتہ بہت سی حدیثیں تجارت کی مدح میں وارد ہوئی ہیں۔ طالب کا مقصد رضائے الٰہی ہونا چاہیے، نہ کہ لذت و کیفیت۔ آپ اس کے قائل تھے کہ ترک دنیا نہیں بلکہ اصلاح دنیا اصل ہے۔

کتابیات

(۱) مولانا محمد حسنی: سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری، لکھنؤ: مجلس تحقیقات ونشریات ندوۃ العلماء، ص: ۲۶۹-۳۲۵
(۲) مولانا ابوالحسن علی حسن ندوی: تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادی، ایضاً، ط: ۲۰۱۲ء، ص: ۹۸-۱۰۲
(۳) حضرت مولانا عبدالباری ندوی: تجدیدِ تصوف وسلوک، ایضاً، ص: ۴۵-۵۱

☆☆☆

علامہ حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات

طلحہ نذیر ندوی
تدریب افتاء

برصغیر کی علمی وفکری تاریخ میں بعض شخصیات ایسی گزری ہیں جنھوں نے ایک سے زائد میدانوں میں غیر معمولی خدمات انجام دیں اور اپنی ہمہ جہت صلاحیتوں کے باعث تاریخ میں اہم مقام حاصل کیا۔ ان ہی درخشاں شخصیات میں مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کا نام بھی آتا ہے۔ آپ جید عالمِ دین، بلند پایہ مؤرخ، کہنہ مشق مصنف، باکمال ادیب اور کامیاب منتظم تھے۔ علومِ دینیہ، تاریخ، ادب اور حدیث؛ ہر شعبے میں آپ کی وقیع اور معتبر تصانیف آپ کے علمی وفکری تنوع کی شاہد ہیں۔ آپ کی علمی وادبی خدمات کے احاطے کے لیے ایک مفصل مقالہ درکار ہے، تاہم چند اوراق کی تحدید کے پیشِ نظر ذیل میں آپ کی بعض نمایاں علمی خدمات کا مختصر مگر جامع تذکرہ پیش کیا جاتا ہے۔

نزهة الخواطر

مولانا حسنیؒ کی سب سے عظیم اور شہرۂ آفاق علمی خدمت ان کی عربی تصنیف "نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر" ہے۔ یہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ایک عظیم الشان تذکرہ ہے، جس میں برصغیر کے چار ہزار سے زائد علماء، محدثین، فقہاء، مفسرین، ادباء اور صلحاء کے مستند حالات جمع کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کی اہمیت اس اعتبار سے بھی غیر معمولی ہے کہ یہ برصغیر کی علمی تاریخ کا سب سے جامع، مستند اور حوالہ جاتی ماخذ شمار ہوتی ہے۔ مولاناؒ نے اس تالیف میں سخت علمی معیار، تحقیق کی باریکی، مصادر پر اعتماد اور دیانتِ علمی کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے، جس کے باعث یہ کتاب اہلِ علم کے یہاں نہایت معتبر حیثیت رکھتی ہے۔

یادِ ایام

یادِ ایام کی تصنیف مولانا حسنیؒ کے محترم اور فاضل دوست نواب حبیب الرحمن خان شیروانی کی فرمائش کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں گجرات کے اسلامی دور کی ہمہ جہت تصویر پیش کی گئی ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اس کتاب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "یہ ہزاروں صفحات اور بیسیوں کتابوں کا عطر ہے، جس میں صرف "سرکار و دربار" کی روداد نہیں سنائی گئی بلکہ اس دور کی پوری تمدنی، علمی اور دینی تصویر مکمل طریقہ پر آگئی۔ شاہانِ گجرات کے خصائصِ حکمرانی، اصلاحاتِ ملکی، زراعت، صنعت و حرفت کی ترقی، علوم و فنون کی اشاعت و فروغ، مدارس کا قیام، ماہرینِ فنون کا تعارف، گجرات کے وزرائے باکمال اور علمائے نامدار کا تذکرہ، ان کے کارنامے اور سلاسلِ طریقت سبھی ضروری مضامین اختصار کے ساتھ آگئے ہیں۔
>
> بیان میں اتنی دل آویزی اور تحریر میں اتنی حلاوت ہے کہ کتاب نہ صرف صحیح تاریخ نویسی کا بلکہ ادب و انشاء کا بھی ایک دلکش نمونہ بن گئی ہے۔"
>
> (حیاتِ عبدالحی: ۳۳۲-۳۳۳)

گُلِ رعنا

گُلِ رعنا شعرائے اردو کا ایک حسین اور منفرد تذکرہ ہے۔ اگر چہ اردو میں تذکرہ نویسی کی روایت قدیم اور وسیع ہے، لیکن یہ کتاب عام تذکروں سے مختلف اور نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ درحقیقت مولانا عبدالحیؒ نے گُلِ رعنا، مولانا محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' کے جواب میں تصنیف کی، جس کے باعث یہ محض ایک تذکرہ نہیں بل کہ تنقیدی اور اصلاحی اہمیت کی حامل کتاب بن گئی، اور اردو تذکرہ نگاری میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت اختیار کر گئی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ تین وجوہات کی بنا پر'' گُلِ رعنا'' کو ترتیب دینے کی ضرورت پیش آئی:

''پہلی وجہ یہ تھی کہ مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں بہت سے ایسے بڑے شعرا کو نظرانداز کر دیا جن کا ادبی مقام مسلّم تھا، بل کہ بعض اعتبار سے وہ ان شعرا سے فائق تھے جنہیں نمایاں جگہ دی گئی۔ متقدمین، متوسطین اور متاخرین تینوں طبقات میں متعدد اہم شعرا یا تو بالکل شامل نہیں کیے گئے یا سرسری طور پر حاشیوں تک محدود رہے، جب کہ بعض کم اثر شعرا کو غیر معمولی اہمیت دی گئی۔ اس عدمِ توازن نے تذکرے کی جامعیت کو متاثر کیا۔

دوسری وجہ آبِ حیات میں پائی جانے والی تاریخی فروگزاشتیں اور غیر مصدقہ بیانات ہیں۔ آزاد نے بعض مقامات پر سنی سنائی روایات، حافظے اور قوتِ تخیل پر اعتماد کیا، جس کے نتیجے میں حقائق میں اضافہ یا تحریف ہوگئی۔ بعض بنیادی مآخذ ان کی نظر سے نہیں گزرے، حتیٰ کہ میر کے تذکرے نکات الشعراء سے متعلق بیانات بھی اصل متن کے خلاف ثابت ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر میر، مرزا مظہر جان جاناں اور دیگر اکابر شعرا کی شخصیات کو غیر منصفانہ انداز میں پیش کیا گیا۔

تیسری وجہ ادبی عدمِ انصاف اور جانب داری ہے۔ بعض شعرا کی حد سے زیادہ مدح کی گئی، جب کہ بعض مسلم الثبوت اکابر (جیسے مومن خان مومن، مصحفی اور بہادر شاہ ظفر) کے ساتھ ناانصافی برتی گئی، بعض مواقع پر مذہبی یا ذاتی رجحان کا اثر بھی محسوس ہوتا ہے۔

ان تمام اسباب کی بنا پر گُلِ رعنا کی تصنیف عمل میں آئی، تاکہ اردو تذکرہ نگاری میں چھوٹ جانے والی کمیوں کی تلافی ہو اور شعرا کا تعارف زیادہ متوازن، منصفانہ اور تحقیقی بنیادوں پر پیش کیا جا سکے۔''

(مزید تفصیل کے لیے: حیاتِ عبدالحی: ۳۳۱-۳۶۵)

اگرچہ آبِ حیات اپنی ادبی قدر و قیمت کے اعتبار سے ایک اہم کتاب ہے، تاہم گُلِ رعنا کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان تسامحات کی نشاندہی اور تصحیح نہایت متوازن اور منصفانہ انداز میں کی گئی ہے۔

تهذيب الأخلاق

تہذیب الاخلاق احادیثِ نبویہ ﷺ کا ایک منتخب مجموعہ ہے۔ اس میں ایسی احادیث کو جمع کیا گیا ہے جو ایک مسلمان کے کردار، عادات اور باطنی صفات کی درست تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ صدق، امانت، حلم، تواضع، صبر، شکر، حسنِ اخلاق، والدین کے حقوق، پڑوسیوں کے آداب اور معاشرتی ذمہ داریوں جیسے اہم موضوعات اس مجموعے کا محور ہیں۔

یہ کتاب دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے درجہ ثانویہ خامسہ اور خصوصی ثانی کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا شمس الحق ندوی نے ''حدیثِ نبوی'' کے نام سے کیا ہے۔ جب کہ مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی نے ''تنویر الآفاق'' اور مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی نے ''روائع الأعلاق''

کے نام سے اس کی عربی شروحات تحریر کیں۔

منتهى الأفكار في شرح تلخيص الأخبار:

یہ "تلخیص الأخبار" کی عربی شرح ہے۔اس میں مسائلِ مختلف فیہ کو نہایت خوش اسلوبی، متانت اور علمی بصیرت کے ساتھ سلجھایا گیا ہے۔ مصنف مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے جو فراست، ذکاوت، سلامتِ طبع اور قوتِ فیصلہ عطا فرمائی تھی، اس کا کامل ظہور اس شرح میں نظر آتا ہے۔

تذكرة الأبرار

یہ کتاب فارسی زبان میں ہے، جس میں مصنف مرحوم کے خاندان قطبیہ حسنیہ کے مشائخ، علماء اور مشاہیر کے حالات و تذکرے جمع کیے گئے ہیں۔

كتابُ الغنا

یہ کتاب مبحثِ غنا پر عربی زبان میں تصنیف کی گئی اور مصنف کے آخری دور کی تصانیف میں شامل ہے۔اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں یہ نہایت جامع اور مکمل سمجھی جاتی ہے، اور مصنف کی سلامتِ طبع اور قوتِ فیصلہ کا واضح ثبوت ہے۔

ارمغانِ احباب

یہ کتاب اس سفر کی یادگار ہے جو مولانا حسنیؒ نے ۱۳۱۲ھ (بہ مطابق ۱۸۸۵ء) میں علماء و مشائخ سے استفادہ کی غرض سے کیا تھا۔اس کتاب سے اس مختصر عرصے میں مسلمانانِ ہند میں پیدا ہونے والے اخلاقی اور مذہبی زوال کی جھلک بخوبی نظر آتی ہے۔

طبيبُ العائلة

یہ کتاب اردو زبان میں ہے، جس میں عورتوں اور بچوں کی روزمرہ بیماریوں، حفظانِ صحت کے اصول اور ہیضہ، طاعون جیسے مہلک امراض کے علاج بیان کیے گئے ہیں۔کتاب نہایت سادہ، مفید اور تجربہ شدہ معلومات پر مشتمل ہے، جس سے معمولی پڑھے لکھے افراد بھی بلا خطر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

تعليمُ الاسلام

یہ کتاب نہایت سلیس اور آسان اردو میں تحریر کی گئی ہے، جس میں وہ ضروری دینی مسائل بیان کیے گئے ہیں جن کی ہر مسلمان کو روزمرہ زندگی میں حاجت پیش آتی ہے۔

نورُ الایمان

یہ اردو رسالہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے لکھا گیا ہے۔اس میں بنیادی عقائدِ اسلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیۂ مبارک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات بیان کیے گئے ہیں۔(حیاتِ عبدالحی: ۳۶۶-۳۶۷)

اس کے علاوہ علامہ حسنیؒ کی شرح سبعہ معلّقہ اور ریحانة الأدب و شمامة الطرب جیسی تصانیف بھی ہیں، جو نا تمام رہ گئیں۔موخر الذکر کتاب کے بعض ابواب مکمل ہیں اور بعض نا تمام ہیں۔یہ تصنیف عربی ادب کے طلبہ کے لیے لکھی گئی تھی۔

بلاشبہ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی محض ایک صاحبِ تصنیف عالم نہیں تھے، بل کہ ایک عہد ساز علمی شخصیت تھے جن کی خدمات علوم دینیہ، تاریخ، ادب، حدیث اور معاشرتی رہنمائی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کی تصانیف میں تحقیق کی گہرائی، اسلوب کی متانت اور فکر کی وسعت نمایاں نظر آتی ہے۔ نزهة الخواطر جیسی شہرۂ آفاق کتاب ہو یا گلِ رعنا کی تنقیدی بصیرت، یادِ ایام کی تاریخی جامعیت ہو یا تہذیب الاخلاق کی تربیتی روح، ہر تصنیف اس بات کی شاہد ہے کہ مولانا حسنیؒ نے علم کو محض محفوظ نہیں کیا، بل کہ اسے زندہ، موثر اور نسلوں کی رہنمائی کا ذریعہ بنایا۔ان کا قلم تاریخ کا امین، ادب کا پاسبان اور دین کا ترجمان تھا۔بلاشبہ ان کی علمی میراث برصغیر کی فکری تاریخ میں ایک ایسا مستقل سرمایہ ہے جس سے اہلِ علم آج بھی استفادہ کر رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔

☆☆☆

علامہ سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ: ایک معتدل مؤرخ
"نزهة الخواطر" کے آئینہ میں

عرفات احمد

عالیہ ثالثہ شریعہ

مولانا سید عبدالحی حسنیؒ ہندوستان کے ان جلیل القدر علماء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے علم و تحقیق کے میدان میں اپنی ایک منفرد اور روشن شناخت قائم کی۔ تاریخ، ادب اور معاشرتی علوم پر آپ کو گہری دسترس حاصل تھی، اور آپ کی علمی وقعت اور فکری گہرائی اپنے عہد میں مسلمہ حیثیت رکھتی تھی۔

نسب کے اعتبار سے آپ ایک معزز اور باوقار خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، اور اخلاق، فضل وکمال، ذوقِ مطالعہ اور شوقِ تحقیق کے اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ ذہانت وفطانت، فہم وفراست، حاضر دماغی، قوتِ ارادہ، صبر واستقامت اور علمی سرگرمیوں سے والہانہ وابستگی آپ کی شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے، جن کے آثار بچپن ہی سے نمایاں ہونے لگے تھے۔ علمی میدان میں آپ کی سعی وکاوش ہمیشہ اس فکری اور تحقیقی خلا کو پُر کرنے کے لیے رہی جو وقت کی ایک اہم ضرورت بن چکا تھا۔ پوری زندگی آپ ان ہی کاموں میں مصروف رہے جو ذہنوں کو جلا بخشتے، فکری پیاس بجھاتے اور علمی دنیا میں نئی راہیں ہموار کرتے تھے۔

نُزهة الخواطر: ایک تحقیقی مطالعہ

ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "نُزهةُ الخواطر" آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک نہایت گراں قدر تاریخی موسوعہ ہے۔ اس عظیم کتاب میں برصغیر کے علماء، ادباء، فضلاء اور نامور شخصیات کے حالات اس حسن ترتیب اور جامعیت کے ساتھ محفوظ کیے گئے ہیں کہ وہ محض تذکرہ نہیں رہتے، بل کہ ایک مستند تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے صفحات میں اس عظیم سرزمین کی علمی، تہذیبی اور ثقافتی خصوصیات بھی پوری آب وتاب کے ساتھ جھلکتی ہیں۔

یہ تصنیف صرف رجال کا تذکرہ نہیں، بل کہ ہندوستان کے روشن علمی ماضی کا آئینہ دار ہے۔ اس میں وہ درخشاں علمی کارنامے نمایاں نظر آتے ہیں جنہوں نے اس خطۂ ارض کو علم و ادب کا عالمی مرکز بنایا۔ جب اسلام کی نورانی شعاعیں ہندوستان تک پہنچیں اور اس سرزمین نے اہلِ علم وعمل کا خیر مقدم کیا، تو یہاں کے علماء نے جس محنت، اخلاص اور استقامت کے ساتھ علمی مشن کو آگے بڑھایا، وہ تاریخ میں کم ہی مثال رکھتا ہے۔

ایک ایسا دور بھی آیا جب ہندوستان پوری امتِ مسلمہ کا علمی اور ادبی محور بن گیا، اور یہاں کے علماء کو دوسرے عجمی علماء کے مقابلے میں علومِ اسلامیہ اور آدابِ دینیہ پر کہیں زیادہ گہری بصیرت حاصل تھی۔

علم وادب کی جن شاخوں میں ہندوستانی علماء نے نمایاں خدمات انجام دیں، ان میں عربی زبان وادب کو خاص مقام حاصل ہے۔ انہوں نے عربی زبان میں ایسی بلند پایہ تصانیف پیش کیں جو

آج بھی علمی شاہکاروں میں شمار ہوتی ہیں (خواہ وہ عربی سے عربی میں ہوں، عربی سے اردو میں، یا عربی سے انگریزی میں منتقل کی گئی ہوں)۔ یہ سب اس حقیقت کی روشن دلیل ہیں کہ ہندوستانی علماء نے عربی زبان و ادب کی خدمت میں تاریخ ساز کردار ادا کیا۔ علم و ادب اور دعوت کے کسی بھی سنجیدہ طالبِ علم کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ امام حسن بن محمد الصغانی لاہوریؒ (م ۱۲۵۲ء) کی گراں قدر تصنیف ”العباب الزاخر واللباب الفاخر“ سے ناواقف ہو، یا شیخ علی المتقی البرہانفوریؒ (م ۹۷۵ء) کی ”کنز العمال“ جیسی عظیم اور معیاری تصنیف سے بے خبر رہے۔

اسی علمی روایت کی ایک نہایت درخشاں کڑی شیخ عبدالحی حسنیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف ”نُزهۃُ الخواطر“ بھی ہے، جو اپنے موضوع پر ایک جامع، ہمہ گیر اور بے مثال موسوعے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی علمی عظمت پر بڑے بڑے اہلِ علم و ادب نے گواہیاں دی ہیں۔ اگرچہ ان تمام آرا کا احاطہ کرنا طویل ہو جائے گا، تاہم دو جلیل القدر شخصیات کی شہادت ہی اس کے مقام و مرتبے کے اثبات کے لیے کافی ہے۔

ایک، جادوئی اسلوبِ بیان کے حامل ممتاز ادیب شیخ علی الطنطاویؒ کی گواہی؛ اور دوسری، نہایت باریک بین محقق اور نامور زبان شناس شیخ تقی الدین الہلالی المغربیؒ کی شہادت۔ یہ دونوں آرا اپنی جگہ ایک نمایاں وزن رکھتی ہیں اور ”نُزهۃُ الخواطر“ کی علمی شان، تحقیقی وقعت اور تاریخی اہمیت کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

کتاب کی جامعیت، تحقیقی دیانت اور اسلوبی انفرادیت

مصنف نے اس عظیم موسوعے کی تالیف میں جس محنتِ شاقہ، باریک بینی اور علمی امانت داری کا مظاہرہ کیا ہے، وہ بجا طور پر قابلِ فخر اور لائقِ تحسین ہے۔ یہ کتاب اسلامی صدیِ اول سے لے کر چودھویں صدی تک ہندوستان کے شعراء، ادباء، مؤلفین، امراء، حکمرانوں، فقہاء، محدثین، مفسرین، رہنماؤں اور قائدین کے حالاتِ زندگی اور علمی و عملی کارناموں کو اس حسنِ ترتیب، وضاحت اور وسعت کے ساتھ جمع کرتی ہے کہ اپنے موضوع پر بے مثال حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

حضرت ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اس کتاب کے مقام و مرتبے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے نہایت بصیرت افروز الفاظ میں لکھا ہے: یہ کتاب برصغیر اور اس سے باہر تاریخ، سیرت اور تذکروں کے ہزار ہا دفاتر میں ایک گوہرِ نایاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف نہ کسی جماعت کی طرف داری کے اسیر ہیں اور نہ کسی فرقے پر جانب داری کے تیور دکھاتے ہیں۔ وہ امانت کو اس کے مستحق تک پہنچانے میں صاحبِ عدل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مصنف نے اس کتاب میں اپنی فطرت کی پاکیزگی، اپنے احساس کی لطافت، اپنی روح کی روشنی اور اپنے ذوقِ جمال کی ساری لذتیں صرف کر دی ہیں، اس لیے یہ کتاب ان کی شخصیت کا عکس بھی ہے اور ان کی روح کا آئینہ بھی۔

مصنف نے اس کتاب میں اپنی فطرت کی پاکیزگی، اپنے احساس کی لطافت، اپنی روح کی روشنی اور اپنے ذوقِ جمال کی ساری توانائیاں صرف کر دی ہیں۔ اسی لیے یہ تصنیف محض ایک علمی کارنامہ نہیں، بل کہ مصنف کی شخصیت کا عکس اور ان کی روح کا آئینہ بن گئی ہے۔ اس کے اوراق میں احساس کی نرمی اور فکر کی وہ شفافیت ہے جو قاری کے دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہے۔ اہلِ فضل کی فضیلت کا کھلے دل سے اعتراف، مدح و نقد میں لطیف اعتدال، انسانی کمزوریوں کی ایسی شائستہ نشان دہی کہ کسی دل کو رنج نہ پہنچے یہ سب اس تصنیف کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس کی عبارت میں تہذیبی شیریں بیانی ہے، اسلوب میں دل آویزی اور کشش ہے، اور مواد میں ایسا خوشگوار تنوع پایا جاتا

ہے کہ قاری نہ تو اکتاہٹ محسوس کرتا ہے اور نہ ہی کتاب سے کنارہ کشی کی خواہش، بل کہ اسے ایک مانوس اور عزیز محفل نشیں کی طرح اپنے ساتھ رکھتا ہے۔

یہ کتاب اپنے علمی سفر کا آغاز اُن جلیل القدر صحابہ، تابعین، غازیوں اور مجاہدوں کے تذکروں سے کرتی ہے جن کی مبارک آمد نے پہلی صدی ہجری میں سرزمینِ ہند کو سعادت اور ہدایت کی روشنیوں سے منور کر دیا۔ پھر یہ سفر بتدریج آگے بڑھتا ہوا اُن اسلاف و اکابر پر آ کر مکمل ہوتا ہے جو علم و فضل کے مینار اور روحانی وراثت کے امین بنے۔

کتاب کا اختتامی حصہ (جو چودھویں صدی ہجری تک کے ہندوستانی علماء اور مشاہیر کے حالات پر مشتمل ہے) کئی پہلوؤں سے پوری تصنیف کا خلاصہ اور تکمیل معلوم ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ کتاب برصغیر کے تقریباً سات سو برس کے علمی سرمائے کا ایک جامع اور منظم احاطہ پیش کرتی ہے۔ اس میں ہزاروں علماء، صوفیاء، ادباء، مؤرخین، شعراء اور قائدین کے حالات اس انداز سے محفوظ کیے گئے ہیں کہ وہ علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی تاریخِ ہند کا ایک مستند اور قابلِ اعتماد ریکارڈ بن جاتے ہیں۔

مزید برآں حضرت مولاناؒ کی دیگر عظیم الشان تصانیف بھی ایسی ہیں جن کے مطالعے سے مولانا کو بحیثیتِ مؤرخ بہتر طور پر جانا، سمجھا اور پہچانا جا سکتا ہے، اور جن سے ان کی تاریخی بصیرت اور فکری گہرائی پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ جیسے:

(۱) الثّقافة الإسلامية في الهند

(۲) مولانا محمد علی منگیری رح کی سوانح کا دلکش منظر کھینچا ہے۔ (السيرة المؤيدية)

(۳) حضرت مجدد الف ثانیؒ کی سوانح جو فارسی میں ہے اس کا اردو ترجمہ (الفتح المبين)۔

اور بھی بہت اہم اور ضخیم تصانیف ہیں جن سے مولانا کے معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ان سب چیزوں میں مولانا کو کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی، اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ممکن ہے جب کسی شخصیت کا تذکرہ پہلے قدیم تذکروں میں پڑھا جائے اور پھر اسی شخصیت کو ''نُزهةُ الخواطر'' میں دیکھا جائے۔ تب واضح ہوتا ہے کہ مصنف کی راہِ تحقیق کس طرح روایتی تذکروں سے جدا اور ممتاز ہے، اور کس بصیرت کے ساتھ انہوں نے (خود اپنے الفاظ میں) رزم و بزم کے افسانوں میں بکھرے ہوئے ان موتیوں کو چن لیا ہے جن سے کھلتے ہوئے جواہر تیار ہو سکتے ہیں۔

اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو کسی نامور اور مرجعِ خلائق شخصیت یا کسی صاحبِ کمال اور مشہورِ عالم کا ترجمہ قدیم تذکروں سے نقل کیا جاتا، پھر اسی شخصیت کا تذکرہ ''نُزهةُ الخواطر'' میں جس انداز سے آیا ہے، وہ پیش کیا جاتا، تاکہ فرق پوری طرح نمایاں ہو جاتا۔ مثال کے طور پر شیخ جہانگیر اشرف سمنانی یا شیخ بدیع الدین مدار مکن پوری کے حالات، یا ملک العلماء شیخ شہاب الدین دولت آبادی اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے تراجم (اگر پہلے قدیم تذکروں میں پڑھے جائیں اور پھر ''نُزهةُ الخواطر'' میں ملاحظہ کیے جائیں) تو مصنف کی انفرادیت، تحقیقی دیانت اور حسنِ انتخاب خود بخود قاری پر منکشف ہو جاتی ہے۔

مصنف کی همه گیر شخصیت

علماء اور اہلِ کمال میں ایسی شخصیات بہ کثرت گزری ہیں جنہیں متعدد علوم و فنون اور مختلف میدانِ کمال میں مہارت حاصل تھی، اور جن کی ذات ایک جامع علمی شخصیت کی صورت پیش کرتی تھی۔ وہ بہ یک وقت نحوی بھی ہوتے، فقیہ بھی، محدث و مفسر بھی، اصولی و متکلم بھی، کامیاب مدرس اور ماہر مصنف بھی۔ تاہم اس ہمہ دانی اور وسعتِ علم کے باوجود عموماً کوئی نہ کوئی ایک ذوق ان پر غالب آ جاتا تھا، اور کوئی خاص فن یا موضوع ان کی علمی زندگی میں

ایسی مرکزی حیثیت اختیار کر لیتا تھا جو ان کے زمانے اور طبقے میں ان کا شعار اور مابہ الامتیاز بن جاتا تھا۔ اسی میدان میں ان کی برتری اور امتیاز کو ان کے معاصر اہلِ علم بھی تسلیم کرتے تھے۔

لیکن وقت کے گزرنے، شہرت کے پھیل جانے اور تصانیف کی کثرت کے باعث اس غالب ذوق اور مرکزی فن یا موضوع کی درست نشان دہی ہر شخص کے بس کی بات نہیں رہتی۔ یہ کام نہ ہر کتاب کے مطالعے سے ممکن ہوتا ہے اور نہ ہر اس شخص کے لیے جو تاریخ کا محض سرسری ذوق رکھتا ہو، بل کہ اس کے لیے گہری واقفیت، باریک بینی اور ایک پختہ تاریخی مزاج درکار ہوتا ہے۔

مولاناؒ کے امتیازات کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے اقوال کو مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اس انداز سے نقل کیا ہے کہ بات دل میں اتر جاتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت الاستاد مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مجھ سے دریافت فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ ابنِ خلکان کی وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اس ''وفياتُ الأعيان'' کو اہلِ علم نے ہر زمانہ میں حرزِ جاں بنا کر بنایا ہے؟''

راقم نے اپنے محدود علم و مطالعہ کی بنا پر کچھ عرض کیا، اس کے بعد فرمایا کہ ابن خلکان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس کا ترجمہ لکھتا ہے اس کے اصل موضوع اور امتیازی علم کا تعین ابتدائی تعارفی عبارت ہی میں کرا دیتا ہے، مثلاً ''فلان النحوی''، ''فلان الجدلی''، ''الفقیہ'' پھر جتنا غور و مطالعہ کیا جائے اس کو اس جگہ سے ہٹانا مشکل ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ'' یہی خصوصیت مولانا سید عبدالحیؒ کی ''نُزهةُ الخواطر'' میں ہے۔''(حیات عبدالحی، ص: ۳۰۳)

کتاب کی بعض امتیازی خصوصیات

''نُزهةُ الخواطر'' کی اس امتیازی خصوصیت کی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، تاہم یہاں چند مثالوں ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس کا حقیقی ذوق اور لطف وہی حضرات محسوس کر سکتے ہیں جو ان شخصیات کے کمالات کے رنگارنگ مرقع میں ان کے اصل کارنامے اور ان کی خدمات کے حقیقی میدان کو پہچاننے کی بصیرت رکھتے ہوں۔ جیسے:

(۱) شیخ عبد الحق دہلوی بہت بڑے فقیہ، محدث، مدرس، مصنف اور صاحب حال وصاحب باطن صوفی تھے، ان کا ترجمہ مصنف اس طرح شروع کرتے ہیں۔ ''الشيخ الإمام العالم العلامة المحدث الفقيه، شيخ الإسلام وأعلم العلماء الأعلام، وحامل راية العلم والعمل في المشائخ الكرام''.

اس میں دراصل ''حامل راية العلم والعمل في المشائخ الكرام'' پوری عبارت کی جان ہے، اور ان کی شخصیت کی کمال معرفت کے لیے کلید کی حیثیت رکھتی ہے، پھر ان کے کارناموں میں سے وہ ہندوستان میں اشاعت علم حدیث کو اصل کارنامہ قرار دیتے ہیں۔

(۲) ملا نظام الدین لکھنوی (جن کو درس نظامی کی وجہ سے عالمگیر شہرت حاصل ہے) ان کا تذکرہ ان شان دار الفاظ سے کرتے ہیں: ''الشيخ الإمام العالم الكبير، العلامة الشهير، صاحب العلم والفنون وغيث الإفادة الهتون، العالم بالربع المسكون، أستاذ الأساتذة وإمام الجهابذة.''

ان القاب واوصاف پر انہوں نے خصوصیت کے ساتھ ان کے کارنامہ اشاعت علمی اور جہاں استادی کی طرف خصوصی اشارہ کیا ہے کہ یہ ان کی زندگی کا عنوان بن گیا ہے، ملا صاحب جامع علوم وکمالات تھے، لیکن مصنف نے اصول ومنطق وکلام کو ان کے خداداد کمالات کا اصل مظہر ومرکز قرار دیا ہے، اسی طرح ان کے با کمال و نامور فرزند ملک العلماء ملا عبدالعلی بحر العلوم کی

ذکاوت خداداد و جولانیٔ طبع کا اصل میدان منطق و حکمت و کلام اور فقہ و اصول کو قرار دیا ہے، لکھتے ہیں:"كان معدوم النظير في زمانه ، رأسا في الفقه و الأصول إماماً جوالا في المنطق و الحكمة و الكلام."

(۳) اسی علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے تذکرہ میں ان کی تصانیف، شروح اور حواشی کی طرف شروع ہی میں خصوصی اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے:"أحد مشاهير الهند، اتفق على فضله علماء الآفاق و سارت بمصنفاته الرفاق."

(۴) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نامور و باکمال فرزندوں میں شاہ رفیع الدین کو علوم عقلیہ و کلامیہ میں امتیاز خاص حاصل تھا اور اس میں وہ اجتہادی شان رکھتے تھے، ان کے تذکرہ میں لکھا ہے :"المحدث، المتكلم، الأصولي، الحجة، الرحلة، فريد عصره و نادرة دهره."

(۵) اسی طرح بسبیل مثال شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا جہاں تذکرہ ہے وہاں پر چند جملوں نے ان کی پوری نقاب کشائی کر دی ہے:"أعلم العلماء في العلوم النافعة، وأحسن المتأخرين ملكة في الفقه وأصوله، وأعرفهم بنصوصه وقواعده." (ایضاً:۳۰۴-۳۰۵)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کا مزاج ابتدا ہی سے تحقیقی، محتاط اور دیانت پر مبنی تھا۔ وہ کسی بات کو بغیر تحقیق کے نقل کرنا علمی امانت کے خلاف سمجھتے تھے۔ اسی سبب ان کی تحریروں میں نہ جذباتیت کا غلبہ ملتا ہے، نہ قصیدہ گوئی کی آمیزش اور نہ ہی غیر ضروری مدح و ستائش۔ ان کا اصل مقصد کسی شخصیت کو غیر معمولی بنا کر پیش کرنا نہیں، بل کہ اسے اس کی حقیقی علمی قدر و منزلت کے ساتھ قارئین کے سامنے رکھنا تھا۔

ترجمہ و تذکرہ نگاری میں حقیقت پسندی ان کا نمایاں امتیاز ہے۔ جہاں کسی عالم کی علمی عظمت کا ذکر ناگزیر ہوتا، وہاں وہ مضبوط دلائل اور معتبر حوالوں کے ساتھ بات کرتے ہیں، اور جہاں کسی کمزوری یا نقص کی نشان دہی ضروری ہوتی، وہاں بھی بلا تردد اس کا ذکر کر دیتے ہیں۔ یہی اعتدال اور توازن ان کے اسلوب کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ نہ ہر شخص کو مجددِ زمانہ قرار دیتے ہیں اور نہ ہر عالم کو بے مثال اور لاثانی بنا کر پیش کرتے ہیں، بل کہ ہر ایک کو اس کے حقیقی مقام پر رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا سید عبدالحی حسنیؒ مبالغہ آرائی سے اس قدر گریزاں تھے کہ اگر کسی شخصیت کے بارے میں تعریف نقل بھی کرتے تو عموماً اسے اپنے الفاظ کے بجائے دیگر معتبر علماء کی آرا کے طور پر پیش کرتے۔ اس طرزِ عمل سے ان کی علمی دیانت اور امانت داری پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحریریں آج بھی اہلِ علم کے نزدیک اعتماد اور اعتبار کی سند سمجھی جاتی ہیں۔

خصوصاً "نُزهةُ الخواطر" میں جن مصادر پر مولاناؒ نے اعتماد کیا، وہ ان کے اعلیٰ تحقیقی معیار کی روشن دلیل ہیں۔ سابقہ کتبِ تراجم، مستند تاریخی روایات، خطوط، اجازت نامے اور بعض مواقع پر ذاتی مشاہدات کو بنیاد بنا کر انہوں نے تراجم مرتب کیے۔ یہی احتیاط اور باریک بینی ان کے کام کو محض تذکرہ نہیں رہنے دیتی، بل کہ اسے ایک معتبر اور مستند تاریخی دستاویز کا درجہ عطا کرتی ہے۔

آخر میں پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا سید عبدالحی حسنیؒ مبالغہ پسند تذکرہ نگار نہیں تھے۔ وہ جو کچھ قلم بند کرتے تھے، تحقیق اور حقیقت کی بنیاد پر کرتے تھے۔ ان کی تحریروں میں اعتدال، امانت اور علمی دیانت کی جھلک نمایاں ہے، اور یہی اوصاف انہیں برصغیر کے عظیم اور قابلِ اعتماد مؤرخین کی صف میں ممتاز مقام عطا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی کامل مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور ان کی علمی خدمات کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین!

☆☆☆

مولانا نواب سید علی حسن خانؒ کی کتابیں: مختصر تعارف

طلحہ نذیر ندوی
تدریب افتاء

مولانا نواب سید علی حسن خانؒ ان شخصیات میں سے ہیں جن کی شخصیت علم، انتظام، ادب اور عمل کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ کم عمری ہی میں غیر معمولی ذہانت اور فکری پختگی نے انہیں علمی حلقوں میں ممتاز مقام عطا کر دیا تھا، پھر ندوۃ العلماء سے ان کی طویل اور مخلصانہ وابستگی نے ان کی شخصیت کو عملی وقار بھی بخشا۔ خاندانی ذوق کے زیرِ اثر وہ اردو، عربی اور فارسی تینوں زبانوں میں شعر و ادب پر قدرت رکھتے تھے: فارسی غزل گوئی کے متاخرین میں ان کا شمار ہوتا ہے، جب کہ اردو شاعری میں لکھنوی اسلوب کے ساتھ اصلاحی و اخلاقی مضامین کی سنجیدہ روایت کو انہوں نے وقار بخشا۔ شاعری اور تصنیف کے میدان میں جو رسائل یا کتابچے ان سے قلم بند ہوئے وہ ان کے ذوقِ سلیم، تاریخی شعور اور ادبی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں ان ہی تصنیفات کا تعارفی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) بزم سخن

یہ کتاب ۱۸۷۹ء میں سب سے پہلے منظر عام پر آئی۔ ۱۷۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب اردو اشعار کا عمدہ انتخاب ہے، اسے مرتب نے اپنے والد ماجد نواب صدیق حسن خان قنوجیؒ کے حکم کی تعمیل میں مرتب کیا تھا۔ مرتب پہلے فارسی میں شاعر کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں اس کے بعد ان کے اشعار نقل کرتے ہیں، جن شعراء کا تخلص حروف تہجی کے اعتبار سے سب سے پہلے آتا ہے، انہیں پہلے ذکر کیا گیا مثلاً حرف الف میں سب سے پہلے مہدی حسن خان کے اشعار ہیں اس لیے کہ ان کا تخلص آباد ہے۔ اس کتاب میں ۴۳۴ شعراء کا تذکرہ شامل ہے۔ کتاب کے سرورق پر ناشر کا نام مفید عام آگرہ درج ہے۔

(۲) طلائع المقدور من مطالع الدهور

یہ تاریخ اسلامی پر ایک اہم کتاب ہے، اس میں انبیاءؑ، صحابہؓ اور مسلم سلاطین اور سلطنتوں کا تذکرہ بڑی خوبی سے جمع کیا گیا۔ مصنف نے زمین کی تخلیق، نبوت و رسالت کی اہمیت کے اجمالی تذکرہ کے بعد انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ کیا، اس کے بعد بالترتیب خلفائے راشدینؓ، خلافت بنوامیہ، خلافت عباسیہ اور دوسری مسلم سلطنتوں اور ان کے سلاطین کا قدرے تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا، مسلمان سلاطین ہند اور خاص کر بھوپال اور اس کی جغرافیہ اور وہاں کے نوابوں کا بھی ذکر کیا۔ کتاب کے اخیر میں ایک ہجری اور عیسوی تاریخ کا ایک جدول بھی ہے، جس میں ہجری اور عیسوی تاریخ کا مقابلہ کیا گیا ہے، یہ جدول ا ہجری سے ۱۳۱۲ ہجری یعنی ۶۲۲ء سے ۱۸۹۴ء تک ہے۔

کتاب کا خط بہت پرانا ہے، اور املا بھی پرانی ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ کتاب دوبارہ جدید انداز میں تحقیق و تخریج کے ساتھ شائع ہو۔

(۳) زبدۃ المفردات

یہ ۷۲ صفحات کا رسالہ دراصل طب کے کئی رسائل کا منظوم شاہکار ہے، طب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے نہایت

مفید اور گنجینۂ معلومات ہے، رسالہ کی افادیت و اہمیت کے بارے خود مصنف رقمطراز ہیں:

"ان دنوں ایک مجموعہ چند رسائل طب کا اردو نظم میں نہایت صاف صاف بہت عمدہ مستغنی الاوصاف ہے۔ بےشائبہ تکلف، جس کا استحضار مطالب و مآرب کم استعداد طبیب کو صاحب استعداد بناتا ہے اور ممارست چند روزہ میں وہ طبیب حاذق کہلاتا ہے۔" (ص ۱۷-۲۷)۔

اس رسالہ کا پہلا ایڈیشن لکھنو کے مشہور مطبع منشی نول کشور سے جنوری ۱۸۸۴ مطابق ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ میں شائع ہوا۔

(۴) تذکرہ صبح گلشن

یہ کتاب ۶۴۶ صفحات پر مشتمل تقریباً ۲۰۰۰ فارسی شعراء کا دل نشین تذکرہ ہے، کتاب کی زبان بھی فارسی ہے۔ کتاب کی وجہ تالیف یہ ہے نواب صدیق حسن خان صاحب قنوجیؒ نے جب فارسی شعراء کا تذکرہ بنام شمعِ انجمن مرتب کیا، تو اس میں بہت سارے شعراء کا تذکرہ رہ گیا تھا، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ان کے صاحبزادے نورالحسن خان صاحب نے اس کا تتمہ "نگارستان سخن" کے نام سے مرتب کیا، نواب علی حسن خان نے محسوس کیا کہ ابھی بھی بہت سارے فارسی شعراء ایسے ہیں جن کا تذکرہ نہ "شمع انجمن" میں آیا ہے اور نہ "نگارستان سخن" میں، لہٰذا انہوں نے مولوی سید یوسف علی صاحب کی رہنمائی میں ایک اور تتمہ "صبح گلشن" کے نام سے مرتب کیا۔

سید شاہ عطاء الرحمن عطاؔ کاکوی نے "صبح گلشن" کا ترجمہ و تلخیص جنوری ۱۹۶۸ء میں عظیم الشان بکڈپو سلطان گنج پٹنہ سے شائع کیا، مصنف نے اصل فارسی کتاب سے ۱۲۲ ایسے شعراء کے تراجم کا اردو جامہ پہنایا، جن کا تعلق اردو شاعری سے بھی ہے، کتاب کے سرورق پر اگرچہ سید علی حسن خان کا نام ہے لیکن مترجم کا خیال ہے یہ کتاب سید علی حسن خان کی نہیں بلکہ مولوی یوسف علی صاحب کی ہے، مترجم کتاب کی ابتدا میں رقمطراز ہیں:

"یہ تذکرہ ۱۲۹۴ھ میں مرتب ہوا اور ۱۲۹۵ھ میں بھوپال سے شائع ہوا، مؤلف کا نام سرورق پر سید علی حسن خان ولد نواب صدیق حسن خان پایا جاتا ہے، حیرت کی بات ہے کہ جس وقت یہ تذکرہ لکھا جانے لگا، صاحبزادے کی عمر صرف گیارہ سال چھ ماہ اور ستائیس دن کی تھی جیسا کہ خود مؤلف نے اطلاع دی ہے، مولوی محمد یوسف صاحب ان کے رہنما تھے، میرا یہ قیاس یقین تک پہنچتا ہے کہ اس کے اصل مؤلف یوسف صاحب مذکور ہی ہیں اور علی حسن خان صرف برائے نام ہے۔"

آگے مترجم کتاب نے "شمع انجمن" اور "نگارستان سخن" کے بارے میں یہ گمان ظاہر کیا ہے کہ ان کتابوں کے اصل مصنف بھی مولوی یوسف علی صاحب ہی ہیں، ہمارا خیال یہ ہے کہ "صبح گلشن" کو نواب علی حسن خان صاحب نے ہی مرتب کیا ہے، اگرچہ تالیف کے وقت وہ کم عمر تھے، جیسا کہ انہوں نے دیباچہ کتاب میں ذکر کیا، لیکن چوں کہ وہ ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا ان سے ایسا کارنامہ سرزد ہونا بعید نہیں ہے، اور پھر خود انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ مولوی یوسف صاحب ان کے رہنما تھے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نواب صاحب نے اپنے استاد کی نگرانی میں یہ تذکرہ مرتب کیا۔

نواب علی حسن صاحب کی یہ سب کتابیں خدا بخش لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رامپور اور علامہ شبلی لائبریری ندوۃ العلماء میں دبیز پردوں کے نیچے موجود ہیں، کاش کوئی فاضل یا کوئی اکیڈیمی ان کتابوں کو از سرِ نو ترتیب دے، جدید اردو املا و خط کا اہتمام کرے اور تحقیق و مراجعت کے بعد عصر حاضر کے معیار کے مطابق اعلیٰ طباعت کے ساتھ شائع کرے۔

☆☆☆

مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ اور ندوۃ العلماء

ضیاء الحسن خان
(علیا اُولیٰ شریعہ (تکمیل))

ندوۃ العلماء کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے درخشاں ابواب میں ایک نہایت روشن اور بابرکت باب حضرت الحاج مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ ندوی کا دورِ نظامت ہے۔ آپ اپنے والد گرامی حضرت مولانا سید عبدالحیؒ ندوی کے انتقال کے بعد ۲۰ر دسمبر ۱۹۲۳ء کو ادارے کے انتظامی شعبے سے وابستہ ہوئے۔ پھر ۶ر اکتوبر ۱۹۲۷ء کو نائب ناظم مقرر ہوئے اور محض چند برس بعد ۹ر جون ۱۹۳۱ء کو ندوۃ العلماء کی نظامت آپ کے سپرد کی گئی، اور اسی منصب پر آپ زندگی کے آخری لمحے تک نہایت استقامت، اخلاص اور کامل دیانت کے ساتھ فائز رہے۔

یہ وہ دور تھا جب امتِ مسلمہ انتشار اور فکری پراگندگی کی شکار تھی، ایسے پرآشوب حالات میں ایسی غیر معمولی شفقت، اخلاص، دوراندیشی اور امتِ مسلمہ کی خیرخواہی کا جذبہ کسی بڑی نعمت سے کم نہ تھی، آپ کی نگاہ ہمیشہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود، علمی و فکری ترقی، اصلاحِ احوال اور عالمِ اسلام کے مسائل پر گہری مرکوز رہی۔

زمانے کے شدید تغیرات اور عالمی سطح پر رونما ہونے والی بڑی تبدیلیوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ ندوۃ العلماء کا تشخص و وجود برقرار رہا، بل کہ آپ کے دورِ نظامت میں ادارہ اُس ترقی سے ہمکنار ہوا جو ترقی اس سے پچھلے ادوار میں کم ہی نصیب ہوئی تھی۔ علمی و فکری استحکام، انتظامی نظم، نصابِ تعلیم کی اصلاح، اور عالمِ اسلام کے ساتھ روابط کی مضبوطی یہ سب آپ کے دور کے وہ روشن نقوش ہیں جنہوں نے ندوہ کی تاریخ کو نئی جہت عطا بخشی۔

دینی حلقوں اور تعلیمی مرکزوں سے تعلق

ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ ندوی کے دورِ نظامت کی سب سے نمایاں اور بنیادی خصوصیت وہ دینی و روحانی فضا تھی جو اس دور میں ندوۃ العلماء میں نہایت واضح اور مضبوط انداز میں پروان چڑھی۔ کسی بھی دینی ادارے کی اصل شناخت اس کا دینی رجحان اور روحانی میلان ہوتا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی آمد سے قبل ندوہ اپنی صحیح پہچان کے ساتھ عام مسلمانوں اور دینی اداروں کے ذہنوں میں پوری طرح اُجاگر نہ تھا۔ معلومات کی کمی اور کچھ غلط فہمیوں کے باعث یہ عظیم ادارہ اُن دینی مراکز اور شخصیات سے وہ قرب حاصل نہ کرسکا جو اس کے شایانِ شان تھا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اس کیفیت کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کرتے ہیں کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء اپنی ہی برادری میں ایک نامانوس اور اجنبی فرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ جس ادارے کا قیام اس مقصد سے ہوا تھا کہ مسلمانوں کو جوڑنے اور اکابرِ امت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا ذریعہ بنے، وہ خود اپنے ماحول میں بیگانگی کا شکار ہوگیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ اس کی دعوت عوام میں اُتر سکی، نہ اپنے جیسے دیگر علمی اداروں سے تعاون و اشتراک کی وہ منزل حاصل ہو پائی جس کی ضرورت تھی۔ لیکن ڈاکٹر صاحبؒ کے دورِ نظامت نے ندوہ کے اس نقشے کو بدل کر رکھ دیا۔ اُن کی دیوبند، سہارنپور اور نظام الدین کے اکابر و مشائخ سے قلبی وابستگی نے ندوۃ العلماء کو اس دینی دھارے سے مضبوطی کے ساتھ جوڑ دیا، جس کی

سرپرستی حضرت تھانویؒ اور دیگر اکابر نے کی تھی۔ ان تعلقات نے ندوہ میں ایک نئی روح پھونک دی، دعوت و اصلاح کے کاموں میں تازہ قوت پیدا ہوئی، اور ندوہ کا رشتہ تبلیغی جماعت اور اصلاحِ امت کی معروف تحریکوں سے مضبوط ہوا۔

اسی دور میں مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت رائے پوریؒ، مولانا محمد زکریا کاندھلوی، مولانا یحییٰ کاندھلویؒ اور دیگر اکابرِ امت کی ندوۃ العلماء میں تشریف آوری نے اس دارالعلوم کے لیے روحانی تازگی، فکری وسعت اور دینی مرکزیت کو نئی بلندی عطا کی۔ (کاروانِ زندگی، ج:۷)

عالمِ اسلام اور عالمِ عرب سے تعلقات:

ندوۃ العلماء کا بنیادی مقصد ہمیشہ سے امتِ مسلمہ کی وحدت کو مضبوط کرنا، عالمِ اسلام کے بکھرے ہوئے حصوں کو جوڑنا، اور اسلام کی صحیح و روشن تصویر پوری دنیا کے سامنے پیش کرنا رہا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ ندوی کے کارہائے فخر میں یہ پہلو بھی نہایت نمایاں ہے کہ ان کے دورِ نظامت میں ندوہ کے روابط عالمِ اسلام اور عالمِ عرب کے ساتھ غیر معمولی حد تک مضبوط ہوئے۔

انہوں نے دونوں خطوں کے درمیان علمی، فکری اور ثقافتی تبادلۂ خیال کی راہیں ہموار کیں، جس کے نتیجے میں نہ صرف ہندوستانی مسلمان عالمِ اسلام و عالمِ عرب کے حالات، تحریکات اور علمی اداروں سے واقف ہوئے، بلکہ اسلامی دنیا کی نمایاں شخصیات نے بھی ہندوستان کے علمی و دینی حلقوں اور ندوہ کی خدمات کا قریب سے مشاہدہ کیا۔

چناں چہ ان کے دور میں عالمِ اسلام کی متعدد ممتاز اور تاریخ ساز شخصیات ندوۃ العلماء تشریف لائیں۔ ان میں خاص طور پر الحاج مفتی امین الحسینی (فلسطین کے مشہور عالم اور مجاہدِ ملت) کا دورہ ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح محمد علی الوبہ پاشا وزیر اوقافِ مصر، اور متعدد اسلامی ملکوں کے جلیل القدر علماء و فضلاء نے ندوہ کو اپنے وجود سے رونق بخشی، ان ہی علمی و ثقافتی روابط کو مضبوط کرنے کے لیے اس کا تقاضا تھا کہ ندوہ کے اردو ترجمان کی طرح عربی زبان میں بھی کوئی ایسا رسالہ ہو جو ادارے کے افکار اور پیغام کی ترجمانی کرے۔ اسی مقصد کے لیے ندوے میں ۱۹۳۲ء میں ماہنامہ "الضیاء" کا اجراء عمل میں آیا، جو اپنے معیار، اسلوب اور جامعیت کے اعتبار سے ندوۃ العلماء کا حقیقی ترجمان کہلانے کا ہر طرح مستحق تھا۔

یہ تمام روابط اس حقیقت کی دلیل ہیں کہ ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ ندوی کے دورِ نظامت میں ندوۃ العلماء محض ایک مقامی درس گاہ نہیں رہا بل کہ عالمِ اسلام کے درمیان ایک مضبوط فکری و روحانی پل کی حیثیت کا حامل رہا۔ (تاریخ ندوہ دوم)

ندوۃ العلماء کے لیے نصابِ تعلیم کی تیاری:

ڈاکٹر سید عبدالعلی ندویؒ کے عہدِ نظامت میں ندوۃ العلماء کی علمی و فکری تاریخ کا ایک نہایت اہم باب رقم ہوا، جس میں عربی زبان و ادب کے ایسے جامع نصاب کی تدوین شامل ہے جو مؤسسینِ ندوہ کی دیرینہ فکر اور بنیادی تخیل کا عملی مظہر تھا، اس نصاب کی تیاری نہ صرف بانیانِ ندوہ کے خدشات کا ازالہ تھی بلکہ ندوۃ العلماء کے اولین نصب العین (اصلاحِ نصاب) کی حقیقی تکمیل بھی تھی۔

اس نصاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا ہر سبق فنی محاسن کے ساتھ عربی زبان کی صحیح، خالص اور ضروری رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اس میں فلسفہ و منطق کی غیر ضروری آمیزش کو دور رکھا گیا ہے اور عربی کو ایک زندہ، متحرک اور باعمل زبان کی حیثیت سے برتنے کی استعداد پیدا کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے طلبہ میں تقریری و تحریری خوابیدہ صلاحیتیں نشوونما پاتی ہے۔

نصاب کی ایک اور اہم اور قابلِ تقلید خصوصیت یہ ہے کہ اسے ایسے نفسیاتی اصولوں کے تحت مرتب کیا گیا ہے جن کے ذریعے بچوں اور نوجوانوں میں اسلامی حمیت، دینی غیرت، اخلاقی تربیت اور مضبوط ایمانی جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ یہ طریقۂ تعلیم محض زبان دانی نہیں بل کہ روحانی، اخلاقی اور فکری تربیت کا جامع ہے۔

ڈاکٹر عبدالعلیؒ کی اصلاحِ نصاب سے متعلق فکر ان کے ان خطوط سے بہ خوبی واضح ہوتی ہے جو انہوں نے مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھے تھے۔ ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں دار العلوم کے نصاب پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے، حجاز اور مصر میں قیام کے بعد جس تعلیم و تربیت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے،'' اس لحاظ سے اپنی رائے قائم کریں تحصیل علم کو آسان کیا جائے اور معیار پست نہ ہونے پائے۔ (فرشتہ صفت انسان: ۱۳۳)

معین الندوہ

ندوۃ العلماء کے قیام کے ساتھ بانیانِ ندوہ کے ہاتھوں مزید جن معاون اداروں کی تاسیس وجود میں آئی تھی ان میں ''انجمن معین الندوۃ'' سرفہرست ہے، جس کی پہلی شاخ ۱۸۹۴ء میں قائم ہوئی۔ ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس جس مقام پر منعقد ہوتا ارکانِ ندوۃ بھرپور کوشش کرتے کہ اس شہر میں ایک انجمن ''معین الندوۃ'' لازماً قائم ہو۔ ''معین الندوۃ'' ندوہ کا بہت ہی قدیم شعبہ ہے لیکن اس سے پہلے دور میں اس میں کافی اضمحلال پیدا ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب کے دور میں جو شعبے دوبارہ سرگرم ہوئے ان میں ''انجمن معین الندوۃ'' بھی ہے اس نے آگے چل کر ڈاکٹر صاحب ہی کے دور میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے شعبے ''تعمیر و ترقی'' کی شکل اختیار کرلی۔ {تاریخ ندوہ دوم}

شعبۂ تعمیر و ترقی

ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کے دورِ نظامت میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں نمایاں تعمیراتی ترقی ہوئیں، اس دور میں دار العلوم کی مسجد تعمیر ہوئی جس میں مولانا مسعود علی ندوی نے خاص تعاون، نگرانی اور انہماک کے ساتھ بھرپور کردار ادا کیا، حتیٰ کہ ڈاکٹر صاحب اور مولانا دونوں شہر جا کر خود چندہ جمع کرتے تھے۔ اسی عہد میں دار العلوم میں پہلی مرتبہ شعبۂ حفظ کا قیام عمل میں آیا۔ طلبہ کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد کے باعث اقامت گاہوں میں سخت تنگی پیدا ہوگئی تھی، یہاں تک کہ رواق نعمانی اور رواق سلیمانی جیسے موجودہ ہاسٹل ناکافی ثابت ہو رہے تھے، اور کمروں میں ضرورت سے کہیں زیادہ طلبہ رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے صحت، صفائی اور نظم و ضبط پر منفی اثرات مرتب ہو رہے تھے، اس ضرورت کے پیشِ نظر شبلی ہاسٹل کے اوپر ایک نئی عمارت، رواق رحمانی، تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چناں چہ ۲۹/ دسمبر ۱۹۵۷ء (جمادی الآخر ۱۳۷۶ھ) کو ڈاکٹر سید عبدالعلی ندوی نے اس کی بنیاد رکھی، اور اس کا نام بانیٔ ندوہ حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری کے نام پر رواق رحمانی تجویز ہوا۔ {تاریخ ندوہ دوم}

اس طرح مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی ندویؒ کا دورِ نظامت ہر لحاظ سے تاریخ ندوہ کا روشن اور مثالی باب ہے۔ کمیت ہو یا کیفیت، نظم ہو یا تعمیر، فکری اصلاح ہو یا علمی ترقی: ہر میدان میں ان کا عہد ایک درخشاں مثال بن کر ابھرتا رہا۔ مسلسل تیس سال تک ندوۃ العلماء کی باگ دوڑ ان کے ہاتھ میں رہی، اور یہ وہ طویل مدت ہے جو ان سے قبل کسی اور ناظم کے حصے میں نہیں آئی۔

اس طویل عرصے میں ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ندوہ کی خدمت کے گرد گھومتا رہا۔ عبادات کے اوقات کے علاوہ ان کی پوری قوت، پوری توجہ اور پوری توانائی اسی ادارے کے لیے وقف تھی۔ ہر شعبے میں وہ ایسی دلچسپی لیتے تھے کہ دیکھنے والا ان کی غیر معمولی محنت اور اخلاص پر حیران رہ جاتا ذاتی آرام، راحت، تفریح اور نجی ضروریات ان کی نظر میں ہمیشہ ثانوی رہیں، اصل ترجیح ندوہ کی بقا، اس کی ترقی اور اس کے ذریعے دینِ حق کی خدمت۔ ان کی یہی بے لوث خدمت، ولولۂ صادق اور عزمِ مصمم ندوۃ العلماء کے لیے فخر سے اپنا سر دھنتا رہے گا۔

ڈاکٹر عبدالعلی سر تا پا صدق و صفا
پیکر علم و عمل اخلاق و اخلاص و وفا
صورت و سیرت میں تھے اسلاف کی زندہ مثال
پاک رو روشن جبی شیری مقال و خوش خصال
ڈاکٹر کے ڈاکٹر اور ماہر طبی قدیم
صاحب قلب و نظر تھے اور دانا و حکیم
فجزاه الله أوفر الجزاء و تغمده برحمته

☆☆☆

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوتی خدمات

عابرعباس
عالیہ ثانیہ شریعہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی ۔ آپ بلند پایا مفکر، مخلص داعی شہرۂ آفاق مصنف ومؤرخ ، ماہر ادیب وانشا پرداز، سحر بیاں مقرر وخطیب اور ممتاز ترین مربی و عالم ربانی تھے ۔مختصر یہ کہ آپ جامع الکمالات شخصیت کے مالک تھے۔

حضرت مولانا کا خاندانی تعلق عرب سے تھا وہ بھی خاندان نبوت سے۔ آپ کے خاندان نے اپنے وطن سے ہزاروں میل کی دوری کے باوجود اپنے نسب کی حفاظت کی اور اپنی زبان یعنی عربی سے تعلق قائم رکھا۔عرب کا خصوصاً خاندانِ نبوت کا سب سے قیمتی سرمایہ اسلام کی دعوت ہے۔آپ کے خاندانی اجداد نے اس سرمائے کی خوب آب یاری کی، اس کا حق ادا کرنے کے لیے اپنی جانوں کو قربان کیا اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو اس میں کھپا دیا۔چوں کہ حضرت مولانا کے اندر دعوت اسلام کی یہ دولت اپنے خاندان سے منتقل ہوئی تو انہوں نے اپنی علمی ، فکری ، ادبی ، اور تاریخی معلومات کی روشنی میں اپنی دعوتی سرگرمیوں کو مرتب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی زندگی میں ایک داعی کی فکر ارجمند اور اس کے اخلاص کا جو ہر جلوہ فگن نظر آتا ہے۔

حضرت مولاناؒ کی جب باقاعدہ اور منظم طریقے سے اپنی تعلیمی تربیت مکمل ہوئی تو ۱۹۳۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر اور ادب کے استاد کی حیثیت سے تقرر پایا۔تقرر کے بعد آپ پوری محنت، یکسوئی اور لگن کے ساتھ تدریسی خدمات میں مصروف ہو گئے۔ اس زمانے میں دارالعلوم میں زبان و ادب اور تحریر وتقریر پر گہری دسترس رکھنے کا رجحان تو موجود تھا، مگر ان امتیازی صلاحیتوں کو کسی واضح دعوتی مقصد کے تحت بروئے کار لانے کی باقاعدہ تحریک اور فکری سمت ابھی پوری طرح قائم نہ ہو سکی تھی۔

حضرت مولانا نے اس صورتِ حال کو محسوس کیا اور خالص دینی ماحول اور دعوتی فضا کی ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، موجودہ ادبی ماحول سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ آپ نے زبان و بیان کی ان قوتوں کو دعوتی میدان میں استعمال کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ اپنے فکری و دعوتی جذبے کو دارالعلوم کی چار دیواری کے اندر منتقل کر دیا، جس کے نتیجے میں وہاں ایک نئی فکری بیداری اور دعوتی شعور نے جنم لیا۔

دعوتی خدمات

حضرت مولانا کا دعوتی وفکری نتیجہ ہے کہ ۱۹۳۹ عیسوی میں آپ کی کتاب ''سیرت سید احمد شہید'' منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی، عقیدت وقدر کی نگاہوں سے پڑھی گئی، معاصر مشائخ نے اس کو قدر ومنزلت اور عقیدت سے قبول کیا، اس وقت کے معروف عالم دین مولانا منظور نعمانیؒ کو بھی حضرت مولانا نے یہ کتاب بہ طور ہدیہ بھیجی، مولانا نے یہ کتاب پڑھ کر ایک تاثراتی خط لکھا اور مزید یہ بھی دریافت کیا کہ عملی طور پر بھی کچھ کرنے کا ارادہ ہے۔ حضرت مولانا نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر دونوں حضرات نے یہ طے کیا ان مراکز کا دورہ کر

لیا جائے جہاں اجتماعی و تنظیمی کام ہو رہا ہو، اگر کسی تنظیم یا دعوتی کام سے ذوقی اتحاد اور عملی شرکت ممکن ہو تو اس میں عملی طور پر شریک ہو کر اس کا تعاون کیا جائے۔ اس تعلق سے دعوت و اصلاح اور تربیت دینی کے مراکز کا سفر شروع کیا۔ پہلے سہارن پور گئے وہاں علماء سے ملاقاتیں کیں، اس کے بعد رائے پور پہنچے۔ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے ملاقات ہوئی ان کے سامنے اپنے عزائم کا ذکر کیا تو حضرت نے اطمینان دلایا اور مشورہ دیا کہ دہلی جا کر نظام الدین مرکز میں حضرت مولانا الیاس کاندھلویؒ سے ملاقات کریں اور ان کے عظیم الشان تبلیغی کام کو دیکھیں۔ وہاں سے دیوبند اور پھر دہلی کا سفر کیا، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ مولانا الیاس کاندھلویؒ دعوتی سفر پر گئے ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ وہاں سے میوات چلے گئے۔ جو مولانا الیاسؒ کی دعوتی تحریک کا اولین ہدف تھا۔ وہاں کام کا مشاہدہ کیا اور تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا۔

''اس سفر میں ہم نے سب سے حیرت انگیز چیز جو دیکھی اور جس سے لازوال شادمانی حاصل ہوئی، وہ میوات کے علاقے میں حضرت مولانا الیاس صاحب کا تبلیغی کام اور نظام ہے۔ ہم نے جو اپنی آنکھوں سے دیکھا، وہ بیسویں صدی عیسوی کا منظر نہ تھا بل کہ پہلی صدی ہجری کا نقشہ معلوم ہوتا تھا'' (کاروان زندگی)

میوات سے واپسی پر حضرت مولانا مرکز تشریف لائے، جہاں حضرت مولانا الیاس کاندھلویؒ سے ایک نہایت خوش گوار ملاقات ہوئی۔ جب مولانا الیاسؒ کو یہ معلوم ہوا کہ آپ سیرتِ سید احمد شہید کے مصنف ہیں اور سید احمد شہیدؒ سے خاندانی نسبت بھی رکھتے ہیں تو اس تعارف نے محبت اور قربت میں مزید اضافہ کر دیا۔ اسی ملاقات کے بعد حضرت مولانا نے دعوت و تبلیغ کے اس عظیم کام کو اپنی ترجیح بنانے اور عملی طور پر اس میں شریک ہونے کا پختہ عزم کر لیا۔

لکھنؤ واپس آ کر آپ نے شہر اور اس کے نواحی علاقوں میں اسی طرز پر دعوتی کام کا آغاز کیا۔ اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر اطراف و اکناف میں تشریف لے جاتے، لوگوں کو دین کی طرف متوجہ کرتے، ایمان کی تجدید کی تلقین کرتے اور نماز کی اہمیت اجاگر کرتے۔ اس کام کی روداد باقاعدگی سے حضرت مولانا الیاسؒ کو ارسال کرتے اور وقتاً فوقتاً مرکز بھی حاضر ہوتے رہتے۔ ایک طویل عرصے تک یہ دعوتی سرگرمیاں مسلسل جاری رہیں، یہاں تک کہ شہر کے دینی ذوق رکھنے والے افراد بھی اس کارِ خیر سے وابستہ ہونے لگے۔

بیرون ممالک کے دعوتی اسفار:

ہندوستان کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا نے بیرون ممالک کے بھی دعوتی اسفار کیے۔ جولائی ۱۹۴۷ عیسوی کو حجاز کا سفر کیا۔ مدینہ منورہ میں مختلف ملکوں کے اجتماعات شروع کیے، جن میں کافی لوگوں نے شرکت کی اور کام کا بڑا استقبال کیا۔ رمضان کا مہینہ تھا تراویح کے بعد علماء کے درمیان حضرت مولانا جس میں مصری، شامی، حجازی، عراقی اور ترکی علماء و مشائخ شریک ہوتے۔ جب مکہ مکرمہ میں قیام رہا وہاں بھی مختلف طبقوں میں کام کیا۔ علماء و ذی اثر لوگوں سے ملاقاتیں کیں، ان میں علوی مکی، شیخ امین کتبی، شیخ حسن مشاط، شیخ عبدالرزاق حمزہ (امام حرم) اور شیخ عمر بن آل الحسن (جو ولی عہد مملکت امیر سعود کے معتمد اور مشیر تھے) قابل ذکر ہیں۔ حجاز کا یہ قیام تقریباً چھ ماہ کا تھا۔ اس سفر سے واپسی کے بعد لکھتے ہیں:

''حجاز سے واپس ہوا تو عربوں کو ان کی زبان میں اسلام کی طرف بازگشت کی دعوت اور عالم اسلام ہی میں نہیں انسانی دنیا میں داعیانہ و قائدانہ کردار ادا کرنے اور قدیم منصب سنبھالنے کی دعوت دل و دماغ پر چھا گئی اور اعصاب پر اس طرح مستولی اور حاوی ہو

گئی کہ اسی کو اپنی زندگی کا مقصد و موضوع بنا لینے کا خیال آنے لگا“ (کاروان زندگی: ۳۵۱)

حضرت مولانا نے حجاز کا دوسرا سفر ستمبر ۱۹۵۰ء میں حضرت رائے پوریؒ کی معیت میں کیا۔ اس سفر میں آپ کے ساتھ چار شاگرد (مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا سید رضوان ندوی اور مولانا طاہر منصور پوری) بھی شریک تھے۔ اس سے قبل آپ اپنے دو شاگردوں، مولانا معین اللہ ندوی اور مولانا عبدالرشید اعظمی ندوی، کو دعوتی سرگرمیوں کے لیے حجاز روانہ کر چکے تھے۔

ادائے حج کے بعد حضرت رائے پوریؒ اپنے وطن واپس تشریف لے گئے، جب کہ حضرت مولانا نے اپنے شاگردوں کے ساتھ دعوتی مقاصد کے لیے مزید قیام فرمایا۔ پہلے سفر میں آپ نے اپنی بالغ نظری سے عرب معاشرے پر مغربی تہذیب کے غلبے کے جو اندیشے محسوس کیے تھے، اس مرتبہ وہ محض خدشات نہ رہے بل کہ واضح حقائق کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ مغربی تہذیب نے بلادِ عربیہ کو متاثر ہی نہیں کیا بل کہ اسے فکری طور پر مفلوج کر دیا ہے۔

اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے حضرت مولانا نے یہ مناسب سمجھا کہ معاشرے کے خواص، خصوصاً ادباء، اہلِ قلم اور تعلیم یافتہ طبقے کی توجہ اس خطرے کی طرف مبذول کرائی جائے۔ اسی مقصد کے تحت آپ نے شیخ احمد عبدالغفور عطار سے ملاقات کی، جو اس طبقے تک رسائی کی ایک اہم کنجی سمجھے جاتے تھے۔ ان کے ذریعے اہلِ قلم، ریڈیو اور صحافت سے وابستہ افراد سے ملاقاتیں ہوئیں اور شیخ محمد سرور الصّبان (نگرانِ سعودی ریڈیو) سے بھی تعارف حاصل ہوا۔ ان کی پیشکش پر ریڈیو کے ذریعے حضرت مولانا کے خطبات نشر ہوئے۔

حضرت مولانا نے ان تقاریر کے لیے ”بينَ العالم و جزيرة العرب“ کا عنوان منتخب کیا۔ پہلی تقریر ”من العالم إلى جزيرة العرب“ کے عنوان سے تھی، جس میں آپ نے کہا کہ عالمِ انسانی جزیرۃ العرب کا شکر گزار ہے ان عظیم احسانات پر جو محمد عربی ﷺ اور آپ کے اصحاب نے انسانیت پر کیے، مگر ساتھ ہی یہ شکوہ بھی کرتا ہے کہ ہدایت اور قیادت سے کنارہ کشی کیوں اختیار کی گئی۔ آپ نے واضح کیا کہ دنیا کو اس تیل کی حاجت نہیں جس سے مشینیں چلیں، بل کہ اس ایمان کی روشنی درکار ہے جو صرف جزیرۃ العرب کے پاس امانت کے طور پر موجود ہے۔

دوسری تقریر ”من جزيرة العرب إلى العالم“ کے عنوان سے کی گئی، جس میں جزیرۃ العرب کی جانب سے عذر و معذرت اور آئندہ اپنی ذمہ داری ادا کرنے کا عزم پیش کیا گیا۔ ان خطبات نے وہاں کے اہلِ علم اور تعلیم یافتہ طبقے پر گہرا اثر ڈالا، یہاں تک کہ وہ حضرت مولانا کی فکر، دعوت اور شخصیت کے معترف اور گرویدہ ہو گئے۔

حجاز میں اہلِ علم سے ملاقاتوں کے دوران حضرت مولانا نے یہ حقیقت محسوس کی کہ وہاں کے علمی حلقوں پر بالخصوص مصر کے علما اور مصنفین کا گہرا اثر ہے، اور وہ فکری رہنمائی میں انہیں اپنا امام مانتے ہیں۔ اس لیے آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر اس خطے میں فکری انقلاب برپا کرنا ہے تو اس کا مؤثر راستہ مصر ہی سے ہو کر گزرتا ہے۔ چناں چہ آپ نے مصر کا رخ کیا۔ اس زمانے میں مصر کے علمی و ادبی افق پر نام ور شخصیات موجود تھیں، جن میں شیخ الازہر امام عبدالمجید سلیم، ڈاکٹر احمد امین، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، احمد زیات اور سید قطب شہید جیسے جلیل القدر علما و ادبا شامل تھے۔ مزید یہ کہ مصر اس وقت یورپ، افریقہ اور ایشیا ہی تینوں برِّ اعظموں کے فکری سنگم کی حیثیت رکھتا تھا۔

حضرت مولانا کے مصر پہنچنے سے قبل ہی آپ کی شہرۂ

آفاق تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" وہاں پہنچ چکی تھی، جو علمی اور ثقافتی حلقوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکی تھی اور آپ کے تعارف کا ذریعہ بن گئی تھی۔ قیامِ مصر کے دوران آپ نے جامعہ ازہر، قاہرہ یونیورسٹی اور تحریکِ اخوان جیسے اہم اداروں اور مؤقر تنظیموں میں اپنی فکری و دعوتی فکر پیش کی، مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور متعدد خطبات کیے۔ ڈاکٹر احمد امین سے آپ کی کئی ملاقاتیں ہوئیں، شیخ الازہر نے آپ کی باتوں کو نہایت توجہ سے سنا، اور جامعہ ازہر کے طلبہ نے آپ سے بھرپور استفادہ کیا (جن میں بعد کے معروف عالم ڈاکٹر یوسف القرضاوی بھی شامل تھے۔)

مصر کے بعد حضرت مولانا سوڈان تشریف لے گئے، جہاں اسماعیل بک ازہر (جو بعد میں سوڈان کے وزیرِ اعظم بنے) اور دیگر علماء و معززین سے ملاقاتیں کیں اور اپنی فکر و دعوت کا تعارف کرایا۔ وہاں سے آپ ملکِ شام روانہ ہوئے، جہاں تقریباً اڑتالیس روز قیام فرمایا۔ اس عرصے میں مختلف علمی، دینی اور ادبی حلقوں کی ممتاز شخصیات سے تبادلۂ خیال کیا اور اپنے دعوتی مشن کو پیش کیا۔ بعد ازاں فلسطین گئے، مسجدِ اقصیٰ کی زیارت کی، متعدد علمی و دعوتی خطبات کیے اور پھر دمشق کے راستے مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے۔ یہ پورا سفر تقریباً تیرہ تا چودہ ماہ پر محیط رہا۔

بلادِ عربیہ کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا نے یورپ اور امریکہ کے بھی اسفار کیے۔ وہاں آپ اپنے خطبات میں اپنے کردار و گفتار کے ذریعے اسلام کی حقانیت کی نمائندگی کرتے، اسلامی عقائد کی حفاظت، اسلامی اقدار کی پاس داری، حضور اکرم ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کی سیرت کی روشنی، اخلاق و اعمال کی اصلاح، اور آخرت و موت کے استحضار کی تلقین فرماتے۔ یوں آپ کی دعوت مشرق و مغرب میں فکری بیداری اور روحانی شعور کا ذریعہ بنتی چلی گئی۔

حضرت مولانا نے اپنے علمی، فکری اور عملی تجربات کی روشنی میں دعوتی کام کو تین واضح شعبوں میں تقسیم کیا۔ پہلا شعبہ عام مسلمانوں کا تھا، جس میں آپ نے حضرت مولانا الیاسؒ کے اختیار کردہ طریقۂ دعوت کو موزوں سمجھا۔ دوسرا شعبہ جدید تعلیم یافتہ طبقے سے متعلق تھا، جن کے مزاج اور استعداد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آپ نے زبان و قلم کے ذریعے دعوت کا اسلوب اختیار کیا۔ جب کہ تیسرا شعبہ اہلِ اقتدار کا تھا، جن کے لیے آپ نے مجددِ الفِ ثانیؒ کے طرزِ دعوت (یعنی خطوط کے ذریعے اور ناصحانہ روابط کے ساتھ تفہیم) کو ترجیح دی۔ ملک کی اکثریتی غیر مسلم آبادی تک حق کا پیغام پہنچانے کے لیے بھی حضرت مولانا نے سنجیدہ اور منظم اقدامات کیے۔ اسی مقصد کے تحت مخلوط (ہندو مسلم) اجتماعات منعقد کیے اور "پیامِ انسانیت" کی بنیاد رکھی، تا کہ انسانی قدروں اور آفاقی اخلاقیات کے ذریعے دعوت کا دائرہ وسیع ہو سکے۔

فکری بصیرت

اگر ایک طرف حضرت مولانا نے ایک مخلص داعی کی حیثیت سے عرب و عجم کی خاک چھانی، تو دوسری طرف اپنی مفکرانہ بصیرت کے ذریعے عالمِ انسانیت کی فکری رہنمائی بھی کی۔ بل کہ یہ کہنا زیادہ بجا ہے کہ آپ کی تمام دعوتی سرگرمیاں آپ کی گہری فکری صلاحیتوں ہی کی آئینہ دار تھیں۔ آپ ہمہ وقت عالمِ اسلام کے حالات سے باخبر رہتے، اور اپنی بالغ نظری سے ابھرنے والے فتنوں اور پیدا ہونے والے خطرات کو بھانپ لیتے۔ پھر انہی خطرات سے بچاؤ اور رہنمائی کے لیے نہایت دل نشیں اور مؤثر پیرائے میں امت کی رہبری فرماتے۔

اسی سلسلے میں آپ نے اہلِ سلطنت اور اربابِ حکومت کی بھی موقع بہ موقع خط و کتابت اور ملاقاتوں کے ذریعے رہنمائی کی۔ امیرِ سعود کو تحریر کیے گئے خط میں آپ نے ایک طرف

حکومتی انتظامات کی ستائش کی، تو دوسری طرف مغرب سے اٹھنے والے ان خطرات کی نشان دہی بھی کی جنھیں آپ نے اپنی چشمِ بصیرت سے محسوس کیا تھا، اور جو اس وقت عالمِ اسلام کے لیے ایک سنجیدہ چیلنج بن رہے تھے۔ بل کہ ایک جگہ عالم عربی کے حکمرانوں کو رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عالم عربی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تجارت، مالیات، صنعت وحرفت اور تعلیم میں پورطور پر آزاد اور خود کفیل ہو، وہاں کے رہنے والے ان ہی چیزوں کا استعمال کریں جو ان کی زمین کی پیداوار ان کی صنعت ومحنت کا نتیجہ ہوں، زنگی کے ہر شعبہ میں وہ مغرب سے مستغنی ہوں''۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر: ۳۶۲)

یہاں صرف ایک مثال پیش کی گئی، اس کے علاوہ سیکڑوں مثالیں ہیں جو حضرت مولانا کے مفکرانہ اور داعیانہ کردار کو بیان کرتی ہیں۔ یہ مختصر مضمون خاص طور پر ماذا خسر العالم، تاریخ دعوت وعزیمت، تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب، دعوت فکر وعمل، میدان دعوت کی وسعت اور طریقۂ کار کی طرف مراجعت نفع بخش ہوگی۔

☆☆☆

صحافت کا مقصد

صحافت کا مقصد ذہن تیار کرنا، صحیح معلومات فراہم کرنا اور صحیح نتائج اخذ کرنا، صحافت ذہن سازی کا کارخانہ ہے، صحافت بالکل پاک ہو، بے داغ اور بے غبار ہو، کوئی سیاسی یا معاشی فائدہ پیش نظر نہ ہو، دوسری چیزوں سے دماغ خراب ہوتا ہے لیکن صحافت سے دماغ کے ساتھ مزاج بھی خراب کیا جاتا ہے، اس سے سوچنے اور غور کرنے کی کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ)

مولانا علی میاںؒ اور عالم عرب

جہانگیر بن فیاض
عالیہ رابعہ شریعہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ" جنہیں پوری دنیا میں "مولانا علی میاں" کے نام سے جانا جاتا ہے، بیسویں صدی کے ایک عظیم مصلح، داعی، ادیب اور مفکر تھے۔ مولاناؒ محض ہندوستان کے ایک عالم ہی نہیں بل کہ ایک ایسی شخصیت تھے جنہوں نے برّ صغیر اور عالم عرب کے درمیان ایک فکری اور روحانی پُل کا کردار ادا کیا۔ ان کی عظمت کا ایک بڑا سبب عربی زبان وادب پر ان کا غیر معمولی عبور تھا، جس کی بدولت انہوں نے عرب ممالک میں براہ راست ایک گہرا اثر ڈالا، جو کسی بھی غیر عرب عالمِ دین کے لیے ایک منفرد مقام اور امتیاز ہے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے عربوں کو ان کے شان دار ماضی کی یاد دلائی اور انہیں مغربیت کے بجائے اپنی ثقافتی اور فکری منبع ومرکز کی طرف لوٹنے کی دعوت دی۔

عالم عرب میں دعوتی کام کے متعلق حضرت مولاناؒ کو اس کی بڑی آرزو تھی (جو آخر وقت تک قائم رہی) کہ اگر ہندوستان کا کام کچھ جم جائے تو آپؒ اپنے چند رفقا کے ساتھ اسلام کے اصل مرکز میں جا کر اس کی ترغیب دیں گے اور وہاں اس کو شروع کریں گے، کیوں کہ یہ وہیں کی سوغات ہے اور وہاں کے رہنے والے اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ (بضاعتنا رُدّت إلينا) کہہ کر اس کا استقبال کریں، پھر ان کے ذریعے سے یہ دولت عالم اسلام میں گھر گھر بٹتے رہے۔

سفر حج اور عالم عرب میں جماعت تبلیغ کا آغاز:

حضرت مولانا محمد الیاسؒ صاحب کو ساری زندگی یہ فکر رہی کہ حجاز مقدس ہی دعوت وتبلیغ کے اس کام کا سرچشمہ اور منبع رہے، وہیں سے یہ صدا بلند ہونی چاہیے، جس کے نتیجے میں مولانا یوسفؒ صاحب نے حجاز مقدس میں کام کے لیے حضرت مولانا عبید اللہؒ صاحب کو متعین کیا۔ مولانا عبید اللہؒ صاحب پوری جانفشانی کے ساتھ اس کام میں مشغول رہے لیکن وہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ اور علمی حلقوں میں ابھی تک اس کی آواز نہیں پہنچ سکی تھی اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ اس طبقے کو جس سطح اور جس اسلوب و زبان سے مخاطب کرنا ضروری تھا اس کی کمی محسوس ہو رہی تھی اور مولانا عبید اللہ صاحب نے مولانا یوسفؒ صاحب کو اس کی طرف بار بار توجہ دلائی کہ یہاں کسی ایسے با اثر اور ادبی ذوق رکھنے والے داعی کی ضرورت ہے جو اس طبقے کو متاثر کر کے ان کو اس کام کی طرف مائل کرے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے خداداد ادبی ذوق، زبان وبیان پر زبردست قدرت اور پھر اس دعوتی فکر ودرد سے یہ حضرات بخوبی واقف تھے۔ کیوں کہ چند ہی ماہ قبل (إلى ممثلي البلاد الإسلامية) کے عنوان سے مولانا علی میاں صاحب نے جو مقالہ تحریر فرمایا تھا وہ حضرت مولانا یوسفؒ صاحب کے

مطالعے میں آ چکا تھا، اس لیے پہلے ہی سے ان حضرات کو مولاناؒ کے اس ذوق کا علم تھا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ قرعۂ فال حضرتؒ کے نام پڑا اور پھر حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ کے مشورے اور ایماء سے بھی یہ طے ہوا کہ حج اور دعوت کی نیت سے حجاز مقدس کا سفر ہو۔

۲۴ رجون ۱۹۴۷ء کو حضرت مولانا نے لکھنو سے اپنی والدۂ محترمہ اور اہلیہ صاحبہ کے ساتھ سفر کا آغاز فرمایا۔ یہ حجاز کا وہ سفر تھا جو ایک ایسے مردِ مومن کے حصے میں آیا، جس کی گھٹی میں حرمین کی عظمت اور محبت رچی بسی تھی۔

دیارِ حجاز میں پیامِ حجاز:

حج وعمرہ کے علاوہ مولانا سفر حجاز کا ایک بڑا مقصد وہاں کے باشندوں کو ان کا مقام ومرتبہ یاد دلانا اور ان کا پیغام سنانا بھی تھا، خاص طور پر دانشور اور تعلیم یافتہ طبقے میں یہ صدا اسی لَے میں بلند کرنی تھی جس سے وہ مانوس ہوں کیوں کہ (كلموا الناس على قدر عقولهم کا اصول ہر جگہ اور ہر زمانے کے لیے ہے اور ہر داعی کے لیے ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے)، تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے ان ہی کی زبان اور اسلوب اختیار کرنا ضروری تھا۔

حضرت مولاناؒ نے جو مقالہ تحریر فرمایا تھا (إلى ممثلي البلاد الإسلامية) اس سفر میں اس کے نسخے ساتھ تھے۔ حضرت نے اس مقالے میں ایسا اسلوب اختیار کیا تھا جس میں دل کا سوز بھی تھا اور بیان کا ساز بھی، اب تک اس طرح کا لٹریچر عربوں تک نہیں پہنچا تھا جس میں دل کے ساز کو چھیڑنے اور دماغ کو متاثر کرنے کی یکساں صلاحیت ہو، اس لیے اس رسالے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، خاص طور پر ہر شہر کے قاضی اور ممتاز علماء تک پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔ مدینہ منورہ کے قیام میں وہاں کے بڑے علماء، ائمۂ حرم اور سربرآوردہ لوگوں کو یہ رسالہ دیا گیا، انہوں نے اس کو صرف قبول ہی نہیں کیا بل کہ اس کے ترجمان بھی بن گئے۔ اس وقت مسجد نبوی کے ایک ممتاز استاذِ حدیث شیخ علی الحرکان نے درسِ حدیث روک کر پورا رسالہ مسجد نبوی میں سنایا۔

مکہ مکرمہ میں وہاں کے کبار علماء سے ربط پیدا ہوا، جس میں امام حرم شیخ عبدالرزاق حمزہ، علامہ سعید علوی مالکی، شیخ امین کتبی، شیخ حسن مشاط، شیخ ابن عربی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات نے بھی رسالہ کو بڑی قدر وقعت کی نگاہ سے دیکھا، مگر اس وقت کے نوجوان، ادباء، اہل قلم اور طبقۂ علماء کے درمیان گہری خلیج حائل تھی اور ان تک بھی اس پیغام کو پہنچانے کی ضرورت تھی، اس سفر میں اس کی بنیاد تو پڑ گئی لیکن باقاعدہ اس طبقے میں اس وقت کام شروع ہوا جب حضرتؒ نے ۱۹۵۰ء میں حجاز کا دوسرا سفر فرمایا۔

حجاز مقدس کا دوسرا سفر:

مفکر اسلام حضرتؒ نے ۱۹۵۰ء میں اپنے کئی شاگردوں کے ساتھ ہم راہ دعوتی مقصد سے حجاز مقدس کا دوسرا سفر کیا۔ اس سفر سے حجاز مقدس کے علماء اور اہل علم و دانش کے حلقوں میں حکیمانہ انداز سے دعوت کا کام شروع ہوا۔ اس سفر میں حضرتؒ نے حکام اور سربراہانِ مملکت سے ملاقاتیں کی اور مختلف دینی و علمی موضوعات، اسلامی مسائل، اصلاحی تحریکات اور تعلیمی منصوبوں پر گفتگو کرنے کا موقع بھی ملا، اگرچہ حضرت کی عمر اس وقت ۳۶ یا ۳۷ سال کی تھی لیکن حضرت مولاناؒ کے بڑے بھائی حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ نے مولاناؒ کی جس انداز میں علمی، فکری اور دینی تربیت کی تھی، اس سے حضرت مولانا کی دینی شعور کے ساتھ علمی وفکری سطح اتنی بلند ہو چکی تھی کہ بڑی سے بڑی علمی، فکری، ادبی اور جدید تعلیم یافتہ شخصیت کے ساتھ آپ پورے اعتماد کے ساتھ گفتگو کرتے اور آپ اپنی علمی وفکری صلاحیتوں سے ان پر اثر ڈالتے، چناں چہ حجاز مقدس کے سبھی حلقوں نے مولانا کے خیالات کو توجہ سے سنا۔

امیر سعود کے نام ایک تاریخی مکتوب:

حجاز مقدس میں حضرتؒ کا قیام کئی ماہ رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سعودی حکومت مستحکم ہو چکی تھی اور مغربی تہذیب نے بھی بال و پر نکالنے شروع کر دیے تھے۔ حضرتؒ نے اپنی ایمانی بصیرت سے اس خطرہ کو محسوس کیا کہ اگر آج اس پر قابو نہ پایا گیا اور حکومت جن بنیادوں پر قائم کی گئی تھی، ان کو مستحکم نہ کیا گیا تو اس کا پورا خطرہ ہے کہ یہ حکومت یورپ کی دل دادہ ہو جائے گی۔ اس خطرہ کو محسوس کر کے حضرتؒ نے اس وقت کے ولیٔ عہد امیر سعود کو ایک تاریخی مکتوب تحریر فرمایا جس میں ان حقائق کو کھل کر پیش کیا اور حکومت کے انتظامات کی ستائش کرتے ہوئے ان خطرات کی نشاندہی بھی کی جو اس وقت درپیش تھے۔ حضرت نے یہ خط اپنے قیام کے آخری دن کچھ قیام گاہ پر کچھ مکہ اور جدہ کے راستے پر اور کچھ جہاز کے انتظار کے دوران تیار فرمایا۔ یہ خط معمولی ترمیم کے بعد ''بين الجباية والهداية'' کے عنوان سے ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا، اور بعد میں ''إلى الإسلام من جديد'' کے مجموعۂ مضامین میں شامل کر دیا گیا۔

چند اہم ملاقاتیں:

(۱) ڈاکٹر احمد امین سے ملاقات بتاریخ: ۱/۳۱/۱۹۵۱ء
اس ملاقات میں مولاناؒ اور ڈاکٹر احمد امین کے درمیان بہت مفکرانہ گفتگو ہوئی اور ڈاکٹر احمد امین نے حضرتؒ کو کچھ کتابیں ہدیہ کی جس میں چھ جلدوں پر مشتمل (العقد الفريد) بھی تھی۔

(۲) شیخ احمد محمد شاکر سے ملاقات بتاریخ: ۱/۳۱/۱۹۵۱ء
جس میں مولاناؒ نے شیخ کو کچھ پمفلٹ اور رسالہ دیئے اور اپنی کتاب (ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين) کا تذکرہ کیا۔

(۳) استاذ محمد فؤاد عبد الباقی سے ملاقات بتاریخ: ۳/ ۲/ ۱۹۵۱ء جس میں انہوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کا تذکرہ خیر فرمایا اور حضرت کی محنت کو سراہا اور مولاناؒ نے ان کو اپنی کتاب ہدیہ میں دی جس کو انہوں نے خوشی سے قبول کیا۔

عالمِ عرب سے چند صاف صاف باتیں:

حجاز میں قیام کے دوران حضرتؒ نے عرب دنیا کا نہایت قریب سے مشاہدہ کیا۔ وہاں کے اخلاقی زوال، حکومتی ظلم و جبر، سیاسی انتشار، دین سے بے رغبتی اور بڑھتی ہوئی مادہ پرستانہ ذہنیت سے آپ پوری طرح واقف ہو چکے تھے۔ آپ نے ایسے قائدین کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جو قوم اور حکومت کے معاملات سے اس طرح کھیل رہے تھے جیسے بچے کنکریوں سے کھیلتے ہیں۔ ذاتی مفادات کی خاطر عوام کو باہم لڑایا جا رہا تھا، اور ایسے ہی افراد کو (جن کے دل اسلام سے مطمئن نہ تھے) اسلام پسند عناصر کے مدمقابل لا کر اقتدار میں لانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔

ان حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد حضرتؒ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس نازک مرحلے میں عالمِ اسلام کو زوال سے صرف ایک ایسی مضبوط اور ہمہ گیر عوامی تحریک ہی بچا سکتی ہے، جس کی بنیاد ایمان و تقویٰ پر ہو اور جس کا مقصد خالصتاً اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔

عالمِ عرب کا المیہ اور اس کے اسباب:

۹/ جون ۱۹۶۷ء کا دن پوری ملتِ اسلامیہ، خصوصاً عالمِ عرب کے لیے ایک المناک اور شرم ناک یاد بن کر طلوع ہوا۔ اس دن مسلمانوں کے سر احساسِ شکست اور ذلت کے بوجھ سے جھک گئے، اور یہ کیفیت اس حد تک پہنچی کہ اپنے ہم وطنوں ہی نہیں، راہ گیروں سے نظریں ملاتے ہوئے بھی شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ اسی دن یہودی افواج عالمِ عرب کے نہایت اہم اور حساس فوجی مراکز پر قابض ہو چکی تھیں۔ اس افسوس ناک ہزیمت کے اسباب پر غور کیا جائے تو عقل حیرت اور اضطراب میں ڈوب جاتی ہے۔

جب انسان ان ممالک کے جغرافیائی محلِ وقوع، ان

کے وسائل، عسکری طاقت اور ظاہری امکانات کا جائزہ لیتا ہے تو یہ سوال اور بھی سنگین صورت اختیار کر لیتا ہے کہ آخر ایسی عبرت ناک شکست کیوں اور کیسے ہوئی؟ ہمیں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ یہ رسوائی، جو پوری دنیا کے سامنے آشکار ہوئی، اس کے پیچھے کون سے اسباب کارفرما تھے۔ کل تک یہی قوم خدائی نصرت کی آغوش میں سمجھی جاتی تھی، فتح وظفر اس کے قدم چومتے تھے، غیر معمولی واقعات اور معجزات اس کے حق میں رونما ہوتے تھے، اور آسمانی لشکروں کے نزول کا تصور اس کے ایمان کا حصہ بن چکا تھا۔ یہاں تک کہ عربوں اور مسلمانوں کے دلوں میں یہ گمان راسخ ہو گیا تھا کہ ہر معرکے میں نصرتِ الٰہی لازماً ان کی ہم سفر ہوگی۔

مگر اس کے باوجود جنگ کا انجام وہ نکلا جو دنیا کے سامنے ہے۔ ایک ایسی شکست جس نے نہ صرف عرب دنیا کو بل کہ پوری امتِ مسلمہ کو شرمندگی اور زوال کے احساس میں مبتلا کر دیا۔ یہ واقعہ محض ایک عسکری ناکامی نہیں تھا، بل کہ ایک فکری، اخلاقی اور روحانی بحران کی علامت تھا، جس پر سنجیدہ غور وفکر وقت کی ایک ناگزیر ضرورت بن چکا تھا۔

حضرت مولاناؒ نے اس شکست وہزیمت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے سب سے پہلا سبب یہ بیان فرمایا کہ مغربی تہذیب اور دولت وثروت کا وہ سیلاب، جو ایک طوفان کی طرح ان ممالک پر امڈ آیا، اس نے امت کے مزاج کو بری طرح متاثر کر دیا۔ یہ وہ امت تھی جو سادگی، مجاہدانہ زندگی اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حامل تھی، مگر بے پناہ دولت نے اس کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی۔ عیش پسندی اور لذت پرستی کی ایسی لہر اٹھی جس نے اخلاق، ضمیر، اصول و تعلیمات اور حلال وحرام کے امتیاز جیسے قیمتی متاع کو بہا کر لے گئی۔

حضرت مولاناؒ دوسرے سبب کے طور پر قومیتِ عربیہ کے نعرے کی نشان دہی فرماتے ہیں، جس نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد عربوں کی زندگی، جذبات اور احساسات پر گہرا اثر ڈالا۔ یہ عصبیت بتدریج پروان چڑھتی گئی اور قوم پرستی کا یہ رجحان اس شدت سے فروغ پایا کہ قوم پرست اس کی تعریف وتشہیر میں اسی جوش وخروش سے مصروف ہو گئے، جیسے دنیا کے مختلف مذاہب کے پیروکار اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت میں سرگرم رہتے ہیں۔

غرض حضرت مولاناؒ ایک ہمہ گیر سیاسی و دینی بصیرت اور باریک بین فکر کے حامل تھے۔ اسلام سے گہری وابستگی، آخرت کی فکر اور انسان دوستی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ آپ کو عالمِ عرب اور اقوامِ مغرب کی تاریخ پر گہری نظر تھی۔ آپ ہر دم انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے فکرمند رہتے۔ اپنی تحریروں اور تقاریر کے ذریعے آپ مسلسل پوری انسانیت کو راہِ راست کی طرف بلاتے اور حق و صداقت کا پیغام عام کرنے کی فکر کرتے رہتے۔

فجزاه الله تعالى عنا و عن جميع المسلمين خير الجزاء .

☆☆☆

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا تنظیموں واداروں کی سربراہی اور شخصیات سے تعلق

مدثر آخون
عالیہ ثالثہ شریعہ

حضرت مفکرِ اسلامؒ نے جس عظیم الشان تحریک میں سب سے پہلے قدم رکھا اور جس کے فیض رساں سایے میں آپ کی فکری وعلمی پرورش ہوئی، وہ تحریک ندوۃ العلماء تھی۔ اس تحریک سے حضرتؒ کا تعلق محض فکری نہیں بل کہ خاندانی بھی تھا۔ آپ کے والدِ گرامی حکیم مولانا سید عبدالحی حسنیؒ اور برادرِ مکرم ڈاکٹر مولانا سید عبدالعلی حسنیؒ نے ندوۃ العلماء کی تعمیر واستحکام میں جو گراں قدر خدمات انجام دیں، وہ تاریخ ندوہ کا روشن باب ہے۔ حضرت مولانا ۱۹۲۹ء میں اس عظیم دانش گاہ میں داخل ہوئے اور یہاں اپنی تعلیم مکمل کی۔ بعد ازاں ۱۹۳۴ء میں آپ ندوۃ العلماء کے استاد منتخب ہوئے، جہاں آپ نے تفسیر، حدیث اور ادبِ عربی کے دروس کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار تاریخ اور منطق کے بعض اسباق بھی پڑھائے۔ یہی وہ دور ہے جس میں حضرت مولانا کا ندوۃ العلماء سے باقاعدہ اور مضبوط تعلق قائم ہوا۔ (مفکر اسلام: ۴۵)

۱۹۴۸ء میں مولانا کو ندوۃ العلماء کی مجلسِ انتظامیہ کا رکن نامزد کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۹ء میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تجویز پر آپ نائب معتمدِ تعلیم منتخب ہوئے۔ پھر ۱۹۵۴ء میں سید صاحبؒ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ معتمدِ تعلیم مقرر ہوئے۔ بعد ازاں ۱۹۶۱ء میں برادرِ بزرگ کی وفات کے بعد حضرت مولاناؒ ندوۃ العلماء کے ناظم مقرر کیے گئے اور تاحیات اسی منصب پر فائز رہے۔ ندوۃ العلماء کی تاریخ میں اس عہد کو بجا طور پر ایک زریں دور قرار دیا جاتا ہے۔

مئی ۱۹۵۹ء میں ندوہ ہی کے احاطے میں ''مجلسِ تحقیقات ونشریاتِ اسلام'' کا قیام عمل میں آیا، جس کے زیرِ اہتمام اردو، انگریزی، عربی اور ہندی زبانوں میں اب تک تقریباً چار سو سے زائد علمی وتحقیقی مطبوعات شائع ہو چکی ہیں۔ مزید برآں، عالمِ عرب میں علمی وفکری سطح پر دینی دعوت اور مذاہب کے تقابلی مطالعے کے فروغ کے لیے مولانا نے ندوہ میں ''المعهد الإسلامي للدعوة و الفكر الإسلامي'' کے نام سے ایک مستقل شعبہ قائم کیا۔

دارالعلوم دیوبند:

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ۱۹۶۲ء سے تاحیات دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں منعقد ہونے والے اجلاس صد سالہ میں عالم عرب کے ممتاز و مقتدر علماء وداعیان کو دعوت دینے اور آمادہ شرکت کرنے کی ذمہ داری مولاناؒ کی تھی، مولانا کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا

گہرا تعلق تھا۔ خود حضرت تھانویؒ مولانا سے بڑی محبت وشفقت اور قدر ونوازش کا معاملہ فرماتے تھے۔

جماعتِ تبلیغ اور مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ربط وتعلق:

بانئ جماعتِ تبلیغ، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ اور ان کی دعوتی تحریک سے حضرت مولاناؒ کا ربط وتعلق آپ کی حیات کا ایک نہایت اہم اور تاریخی حصہ ہے۔ ۱۹۴۰ء میں حضرت مولانا علی میاںؒ کی مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ سے ملاقات ہوئی، اور اس ملاقات کے بعد گویا جماعتِ تبلیغ اور اس کے بانی کے فکری وعملی ترجمان بن گئے۔

چناں چہ تبلیغی اسفار کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ فرصت کا شائبہ بھی باقی نہ رہا۔ اسی دوران حضرت مولاناؒ نے ستمبر ۱۹۴۲ء میں ندوۃ العلماء کی تدریسی ذمہ داریوں سے طویل رخصت اختیار کی اور یکسو ہوکر تبلیغی سرگرمیوں میں منہمک ہوئے۔

(کاروانِ زندگی ہفتم: ۲۶۳ / ۲۶۴)

جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق:

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کو مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ سے ۱۹۳۴ء کے بعد ہی شناسائی ہوئی۔ ندوۃُ العلماء میں تدریس کے زمانے میں آپ نے مولانا مودودیؒ کی تصانیف اور مقالات سے خاطر خواہ استفادہ بھی کیا۔ ۱۹۴۱ء میں جب مولانا مودودیؒ لکھنؤ تشریف لائے اور ندوہ کے مہمان خانے میں قیام پذیر ہوئے تو حضرت مولانا علی میاںؒ نے اپنے دیرینہ رفیق مولانا منظور نعمانیؒ کے ساتھ جماعتِ اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ تقریباً تین برس تک جماعتِ اسلامی لکھنؤ کے امیر رہے۔ اس دوران آپ کو بعض امور کا گہرا اور تشویش ناک احساس ہوا۔ اوّل یہ کہ مولانا مودودیؒ کے بارے میں جماعت کے بعض معتقدین اور محبین غلو اور مبالغہ سے کام لینے لگے تھے، جس کے نتیجے میں دوسرے داعیانِ دین اور مفکرین سے بے رغبتی بل کہ بیگانگی پیدا ہو رہی تھی، جو نہایت خطرناک رجحان تھا۔ دوم یہ کہ تنقید کے باب میں ایک غیر محتاط اور بے باک انداز رائج ہو چکا تھا، جس کے باعث علمائے کرام اور دیگر دینی حلقوں پر طعن وتشنیع کا مزاج فروغ پا رہا تھا۔ سوم یہ کہ جماعت کے اندر دینی تڑپ، اصلاحِ نفس کا نمایاں جذبہ اور تعلق باللہ میں سنجیدہ اضافے کی عملی کوشش کمزور دکھائی دیتی تھی۔

یہی وہ اسباب تھے جن کی بنا پر حضرت مولاناؒ نے جماعتِ اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی عرصے میں بانئ جماعتِ تبلیغ، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کی تحریکِ دعوت سے آپ کا تعلق مزید مضبوط ہوتا گیا۔ اس صورتِ حال سے حضرت مولاناؒ نے خود مولانا مودودیؒ کو بھی آگاہ کیا، جس کے جواب میں مولانا مودودیؒ نے انہیں یکسو ہو جانے کا مشورہ دیا۔ چناں چہ ۱۹۴۳ء میں حضرت مولاناؒ جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہو گئے۔

حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ سے تعلقات:

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ۱۹۳۹ء میں حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت رائے پوریؒ کی فنایت وبے نفسی، دینی وسعت وحقیقت پسندی اور بے پایاں شفقت نے حضرت مولانا کو اس درجہ متاثر کیا کہ آپ نے عقیدت واعتماد کے ساتھ حلقۂ بیعت میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت مولاناؒ، حضرت رائے پوریؒ کے خلیفہ اور مجاز بھی تھے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے حضرت مولانا کا تعلق ۱۹۴۰ء سے قائم ہوا، جو ابتدا ہی سے محبت وشفقت پر قائم ہوا اور آخر دم تک برقرار رہا۔ اس گہرے تعلق کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الحدیثؒ نے اپنی

تمام عربی تصانیف کے مقدمات حضرت مولانا سے تحریر کروائے، جب کہ حضرت مولاناؒ نے خود شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کی سوانحِ حیات ''سوانح شیخ الحدیث'' کے نام سے قلم بند کی۔

وہ تحریکیں جن سے براہ راست تعلق تھا

مجلس مشاورت:

یہ وہ تحریک تھی جس کو دسمبر ۱۹۶۳ء اور فروری و اپریل ۱۹۶۳ء کو کلکتہ، جمشید پور اور رانچی کے فرقہ وارانہ فسادات کو دیکھ کر بنایا گیا تھا۔ بعض وجوہات کی بنا پر یہ تحریک زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔

تحریکِ پیامِ انسانیت:

تحریکِ پیامِ انسانیت دراصل حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے قلبِ صافی کی گہرائیوں سے ابھرنے والی ایک خالص انسانیت اور اخلاقیت پر مبنی تحریک تھی۔ تحریک کا آغاز ۱۹۵۱ء میں ہوا، جس کے تحت مختلف مقامات پر ہندو مسلم مشترکہ اجتماعات منعقد کیے گئے۔ لکھنؤ، گورکھپور، جونپور، مئو اور غازی پور جیسے شہروں میں متعدد پروگرام منعقد ہوئے اور انسانی اخوت، باہمی احترام اور اخلاقی ہم آہنگی کا پیغام عام کیا گیا۔

۱۶/ اپریل ۱۹۷۸ء کو ایک عظیم الشان جلسۂ عام منعقد ہوا، جب کہ ۳۱/ دسمبر ۱۹۷۸ء کو مولانا نے مراد آباد میں ایک مؤثر اور یادگار اجتماع سے خطاب کیا۔ تحریکِ پیامِ انسانیت کا سب سے کامیاب اور حیرت انگیز دورہ ۲۱/ مارچ سے ۳۱/ مارچ ۱۹۷۸ء کے درمیان ہریانہ اور پنجاب میں انجام پایا، جس نے اس تحریک کو نئی وسعت اور غیر معمولی پذیرائی عطا کی۔ حضرت مولاناؒ نے تاحیات اس عظیم مقصد کے لیے جدوجہد جاری رکھی، اور اس کے ثمرات آج بھی ہمارے سامنے روشن اور واضح صورت میں موجود ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت مولاناؒ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ سے بھی گہرا اور فعال تعلق رکھتے تھے۔ ۷/ جون ۱۹۸۳ء کو حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ کے انتقال کے بعد آپ کو بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا۔ مزید برآں، حضرت مولاناؒ دینی تعلیمی کونسل سے بھی وابستہ رہے اور اس کے علمی و تعلیمی مقاصد کی تکمیل میں مؤثر کردار ادا کیا۔

رابطۂ ادبِ اسلامی کا قیام:

۱۷، ۱۸ اور ۱۹ اپریل ۱۹۸۱ء کو حضرت مولاناؒ کی خواہش اور رہنمائی میں ندوۃُ العلماء میں رابطۂ ادبِ اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ اس سے قبل ندوہ میں ایک اہم علمی سیمینار منعقد ہوا، جس میں عالمِ عرب کی ممتاز اور معزز علمی شخصیات نے شرکت کی۔ ان میں شیخ عبدالعزیز رفاعی، ڈاکٹر عبدالرحمن رأفت الباشا اور شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری جیسے جلیل القدر اہلِ علم شامل تھے، جن کی شرکت نے اس اجتماع کو علمی وقار اور بین الاقوامی اہمیت عطا کی۔

عالمِ عرب کی تحریکات، اداروں اور شخصیات سے تعلق:

۱۹۶۲ء میں حج کے موقع پر مملکتِ سعودی عرب نے عالمِ اسلام کے علما اور دانش وروں کو اتحادِ اسلامی کے امکانات پر غور و فکر کے لیے مکہ مکرمہ مدعو کیا۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی کے طور پر ۱۸/ مئی ۱۹۶۲ء کو رابطۂ عالمِ اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ حضرت مولاناؒ ابتدا ہی سے اس ادارے کی سرگرمیوں سے وابستہ رہے اور مسلسل رابطہ کے اجلاسوں میں شرکت فرماتے رہے۔

ان جلسوں میں سب سے زیادہ معزز اور یادگار وہ اجتماع تھا جس میں حضرت مولاناؒ کو کعبۂ معظّمہ کی کلید عطا کی گئی اور آپ کو خانۂ کعبہ کے اندر نماز ادا کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ مزید برآں، رابطۂ عالمِ اسلامی کے زیرِ انتظام قائم المجلسُ العالمي للمساجد اور المجمع الفقهي میں بھی حضرت مولاناؒ کو رکنیت کے لیے منتخب کیا گیا، جو عالمِ اسلام میں آپ کے علمی وقار اور فکری مقام کا بین ثبوت ہے۔

تحریک اخوان المسلمین:

حضرت مولاناؒ شیخ حسن البنا شہید سے بہت متاثر تھے،ان کی شہادت ۱۹۴۹ء میں ہوئی بعد میں جب حضرت مولاناؒ نے ۱۹۵۱ء میں مصر کا دورہ کیا تو اس وقت کے مشہور اخوانی رہنما استاد بہی خولی اور دیگر اخوانی پرجوش کارکنوں میں سے شیخ صالح عشماوی "مدير الدعوة"، استاذ عبدالحکیم عابدین، ڈاکٹر سعید رمضان وغیرہ سے ملاقات کی۔ ۱۹۵۷ء میں دمشق کی مشہور اور موقر اکیڈمی "المجمع العلمي" نے ہندوستان کی طرف سے حضرت مولانا کو اپنا مراسلاتی رکن منتخب کیا۔ ۱۹۸۰ء میں مولانا "مجمع اللغة العربية" اردن کے رکن بنائے گئے۔ مولانا "رابطة الجامعات الإسلامية" (Islamic Universities federation) کے بھی رکن تھے۔ ۱۹۸۴ء میں حضرت مولاناؒ کو شرق اردن کے علمی و تحقیقی ادارہ "مؤسسة آل البيت" نے اپنا رکن منتخب کیا۔ ان اداروں کے علاوہ حضرت مولانا متعدد عرب اداروں اور تحریکات کے رکن تھے جن میں قاہرہ کی "مجمع اللغة العربية" اور "المجلس الأعلى العالمي للدعوة الإسلامية" بھی شامل ہے۔

عالم عرب کے علماء وادباء سے ربط وتعلق:

عالم عرب کے معاصر علماء وادباء تقریباً سبھی سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق و ربط تھا، جن کے ساتھ مولانا نے ۱۹۵۱ء میں اپنے شرق اوسط کے طویل سفر کے دوران ملاقات کی، ان میں ڈاکٹر احمد امین سر فہرست ہیں، سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مولانا نے ملاقات کی، ان کی کتاب "العدالة الاجتماعية في الإسلام" سے مولانا بہت متاثر تھے۔ سید قطب شہید نے مولانا کی چند کتابوں پر مقدمہ بھی لکھا ہے، جن میں مولانا کی مشہور کتاب "ماذا خسر العالم" قابل ذکر ہے۔ اسی طرح مفتی امین الحسینی سے بھی مولانا کے گہرے روابط تھے، مشہور ادیب شیخ علی طنطاوی سے بھی بڑا تعلق تھا، عالم عرب کے دیگر ممتاز علماء وادباء میں محمد الغزالی، محمد قطب، شیخ بهجة البیطار، محمد کرد علی، محمد محمود صوّاف، انوار الجندی، شیخ محمد بن عبداللہ سبیل امام حرم، شیخ یوسف القرضاوی، شیخ بن باز، ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ اور ان جیسے دیگر فضلاء سے مولانا کا تعلق و ربط تھا۔

(مفکر اسلام جامع کمالات شخصیت، ص: ۲۶۰)

☆☆☆

"واقعہ یہ کے کہ تصنیف و تالیف اور زبان و ادب میں ندوہ کا بڑا حصہ ہے اور اردو زبان میں اسلامی تاریخ اور سیرت و تذکرہ پر جو کچھ کام ہوا ہے، قریب قریب اس کے ۷۵ فی صد حصہ فرزندان ندوہ کے قلم کا رہین منت ہے۔"

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ: ۱۳۹

مولانا علی میاںؒ ندوی کی اہم تصنیفات اور ان کا مختصر تعارف

ندیم حسین بیگ
عالیہ ثالثہ شریعہ

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اُن عبقری شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے علم وفکر، اور قلم وزبان کی اثر آفرینی کے ذریعے نہ صرف برِّصغیر بل کہ پوری دنیا میں ایک ایسا بلند مقام حاصل کیا جو تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ روشن رہے گا۔ آپ برِّصغیر کے اُن عظیم مفکرین میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی فکری گہرائی اور قلمی قوت کے ذریعے امتِ مسلمہ کو نئی فکری جہت اور واضح سمت عطا کی۔ ان کی تحریروں میں اخلاص کی خوش بو، فکری پختگی، ذوق کی بالیدگی اور دردِدل کی ایسی شدت پائی جاتی ہے، جس نے لاکھوں قلوب کو جھنجوڑا ہے۔ ان کی تحریر محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بل کہ ایک زندہ حقیقت ہے، جو دلوں کو گرما دینے والی، روح کو تڑپا دینے والی، ذہنوں کو جلا بخشنے والی اور کردار میں حرارت وعمدگی پیدا کرنے والی ہے۔ انہوں نے قلم کو محض اظہارِ خیال کا ذریعہ نہیں، بلکہ ایک امانت سمجھ کر برتا اور دینی دعوت، تاریخی تحقیق اور تہذیبی اصلاح کو اپنی تحریروں کا اصل مقصد بنایا۔ ان کے اسلوبِ نگارش میں سادگی اور شائستگی بھی ہے اور دل نشینی بھی، جس کے باعث قاری شعوری اور فکری سطح پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ علمی وقار، روحانی بصیرت اور تہذیبی شعور کے ساتھ انہوں نے ایسے گراں قدر آثار چھوڑے جنہوں نے عالمِ اسلام میں انہیں ایک مسلمہ اور بلند مقام عطا کیا۔ اسی بنا پر ان کی تصانیف محض چند کتابیں نہیں، بل کہ فکر ودعوت کی ایک روشن شاہراہ اور ایک مسلسل تحریک کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تصانیف نہایت وسیع اور جامع ہیں، اور ان کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے۔ تاہم اہم کتابوں کا تذکرہ اور ان کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے:

(۱) سیرت سید احمد شہید:

مولانا کی پہلی تصنیف "سیرتِ سید احمد شہید" ہے، جو غالباً ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس وقت مولانا کی عمر محض ۲۳ برس تھی، جب انہوں نے یہ گراں قدر کتاب تصنیف کی۔ نوعمری کے اس دور میں لکھی گئی یہ تصنیف برطانوی اقتدار کے زیرِ سایہ ہندوستانی مسلمانوں کے شکست خوردہ اذہان میں حوصلہ اور ولولہ بیدار کرنے کا سبب بنی، اور سامراجی حکمرانی کے خلاف باعزت، باوقار اور زندگی گزارنے کی آزادی کی امنگ پیدا کی۔

اس کتاب میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی مفصل سوانحِ حیات، آپ کے اخلاقی وتجدیدی کارنامے، غیر منقسم ہندوستان کی عظیم تحریکِ جہاد، اصلاح وتجدید کی جدوجہد اور احیائے خلافت کی تاریخ نہایت جامع انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اس تصنیف کے منظرِ عام پر آنے سے ہندوستانی مسلمانوں کے شکستہ دلوں میں امید کی ایک روشن کرن جاگی، اور اسی کے ساتھ مولانا کو ہندوستان کے علمی اور دینی حلقوں میں ایک باوقار اور مستند تعارف بھی حاصل ہوا۔

(۲) ماذا خسر العالم بإنحطاط المسلمین

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر):

یہ مولانا کی شہرۂ آفاق کتاب ہے، اس کتاب نے عالم عرب پر وہ اثر ڈالا اور ان کے نوجوان اور دانشور طبقے میں اسلام اور مسلمانوں کے تئیں وہ اعتماد بحال کیا جو متزلزل ہو چکا تھا۔ اس کتاب کی کہانی یہ ہے کہ عربوں کو متوجہ کرنے کے لیے مولانا نے کچھ مضامین لکھے، ان مضامین نے یہ خیال پیدا کیا کہ ان میں مناسب اضافہ کر کے ایک جامع کتاب بنا دی جائے، جس میں اسلام کے عہد اول کی دینی وسیاسی فتوحات کا جائزہ بھی آجائے اور پھر اس خیر امت کے زوال اور اس کے حریفوں کی ترقی وکمال کے تذکرے کے ساتھ صحیح اسباب ومحرکات کا تعین بھی آجائے اور ان اسباب ومحرکات کو سمجھ کر پھر اپنی سربلندی کی طرف لوٹ سکنے کی بھرپور توقعات بھی سامنے آجائیں۔ اس کتاب کو مکمل کرنے کے بعد قاہرہ کے کسی دارالاشاعت کا انتخاب کر کے اسلامی رجحان کے حامل ڈاکٹر احمد امین کے زیر انتظام مرکز اشاعت "لجنة التاليف والنشر" مناسب معلوم ہوا پھر یہ کتاب ۱۹۵۰ء کے آغاز میں چھپ کر عرب کتب خانوں میں آ گئی۔ کتاب کی پسندیدگی اور اثر پذیری کی جو توقع تھی اس سے زیادہ اس کی ظاہر ہوئی۔ "سیرت سید احمد شہید" اور "ماذا خسر العالم" یہ دو مولانا کی اولین تصنیفات ہیں، جن سے مولانا بطور مصنف ومفکر اور عالم اسلام کے داعی کے طور پر ایک نمایاں شخصیت بن کر سامنے آ گئے۔

(۳) نبئ رحمت:

یہ دراصل "السيرة النبوية" کا اردو ترجمہ ہے، جسے مولانا سید محمد الحسنیؒ نے اس قدر شگفتہ، رواں اور فصیح انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے گویا یہ کتاب ابتدا ہی سے اردو زبان میں تصنیف کی گئی ہو۔ اس تصنیف میں سیرتِ نبوی ﷺ کو نہ تو کسی ذاتی فلسفیانہ رنگ میں ڈھالا گیا ہے اور نہ ہی اسے زمانے کے مروجہ نظریات کے سانچے میں فٹ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، بل کہ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو اسی طرح پیش کیا گیا ہے جیسی وہ حقیقت میں تھی۔ مصنف نے پوری دیانت اور احتیاط کے ساتھ سیرتِ رسول ﷺ کو اس کی اصل، سچی اور مستند صورت میں، اپنی طرف سے کسی قسم کے اضافہ یا تصرف کے بغیر پیش کرنے کی سعی کی ہے، جس کے باعث یہ کتاب سیرت نگاری میں سادگی، صداقت اور علمی وقار کی ایک نمایاں مثال بن گئی ہے۔

(۴) کاروان مدینہ:

اس کا عربی نسخہ "الطريق إلى المدينة" کا نام سے ہے۔ یہ مختلف تقریروں اور مضامین کا مجموعہ ہے، جس کا تعلق ذات نبوی اور آپ کی سیرت پاک کی تعلیمات، پیام، اس کے احسانات اور اس کے عالمگیر نتائج اور اثرات سے ہے۔ اور آخر میں ایک نعتیہ تمثیلی مشاعرہ بھی ہے جس میں فارسی اور اردو کے مشہور شعراء نے بارگاہ نبوی میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔

(۵) المرتضیٰ:

یہ خلیفہ چہارم امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالبؓ کی مفصل سوانح حیات ہے جس میں ان کی خاندانی خصوصیات وکمالات خلفاء کے عہد خلافت میں اللہ کی حکمت وقدرت کی کار فرمائی اور دینی واسلامی اور ملی مصلحت کو بیان کیا گیا ہے اس کے ساتھ ان کے عہد کی عظیم مشکلات اور ان کے مصلحانہ اور مربیانہ کردار کو بیان کیا گیا ہے، نیز ان کے صاحبزادگان جنت کے سرداران حضرات حسنین کی سیرت واخلاق کا بھی تذکرہ ہے۔ یہ کتاب بھی عربی میں لکھی گئی جس کا اردو ترجمہ مصنف کی ایما پر مشہور ادیب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی صاحب کے قلم سے ہے۔

(۶) تاریخِ دعوت وعزیمت

مولانا کی یہ تصنیف پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، جو عربی

زبان میں ”رجالُ الفكرِ والدعوة في الإسلام“ کے عنوان سے منظرِ عام پر آئی اور غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ یہ مولانا کے علمی سرمایۂ حیات کی ایک درخشاں مثال ہے، جس میں انہوں نے اسلام کی دعوت، اس کے داعیانِ حق، اور ان کی جدوجہد، قربانیوں، صبر اور عزیمت کی پوری تاریخ کو نہایت جامع، دل نشیں اور تحقیقی اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں مختلف ادوار کے مصلحین اور داعیانِ دین کی خدمات کو واضح انداز میں اجاگر کیا گیا ہے اور یہ حقیقت آشکار کی گئی ہے کہ کس طرح دینِ حق کی دعوت شدید مشکلات، آزمائشوں اور رکاوٹوں کے باوجود مسلسل آگے بڑھتی رہی۔ یہ تصنیف محض تاریخی بیانیہ نہیں، بل کہ دعوتِ اسلامی کے مزاج، اس کی روح اور اس کے تسلسل کی ایک زندہ دستاویز ہے۔

(۷) جب ایمان کی بادِ بہاری چلی

اس کتاب میں تیرہویں صدی ہجری کے عظیم مصلح ومجاہد، امیرُ المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی جماعتِ مجاہدین کی حیاتِ مبارکہ سے متعلق سبق آموز، موثر اور ولولہ انگیز حالات و واقعات کو نہایت دل نشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مولانا نے اس تصنیف کو پہلے عربی زبان میں ”إذا هبَّت ريحُ الإيمان“ کے عنوان سے قلم بند کیا، جسے بعد ازاں مولانا محمد الحسنی صاحب نے اردو قالب میں منتقل کیا۔ یہ کتاب ایمان کی حرارت، دینی حمیت اور جذبۂ قربانی کو بیدار کرنے والی تحریر ہے، جس نے قارئین کے دلوں پر گہرا اثر چھوڑا اور غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ یہ تصنیف محض تاریخی واقعات کا بیان نہیں، بل کہ ایمان افروز تحریکات کی روح اور ان کے پیغام کی زندہ تصویر ہے۔

(۸) ذکرِ خیر

اس کتاب میں مولانا نے اپنی والدۂ محترمہ، سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہؒ کی قابلِ رشک حیات، ان کے بلند اخلاق، اور ان کی تربیتی و تصنیفی خدمات کو قلم بند کیا ہے۔ یہ تصنیف ایک عظیم ماں کے کردار اور اس کی علمی و اخلاقی تربیت کی روشن تصویر پیش کرتی ہے۔ یہ کتاب مکتبۂ اسلام، لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے اور اپنے موضوع، اسلوب اور تاثیر کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

(۹) کاروانِ زندگی

سات حصّوں پر مشتمل یہ کتاب مولانا کی خودنوشت ہے، جس میں انہوں نے اپنی ذاتی زندگی کے مشاہدات، تجربات، احساسات اور تاثرات کو نہایت سادگی اور صداقت کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ اس سرگزشت کے آئینے میں ایک فرد کی زندگی ہی نہیں، بل کہ پوری بیسویں صدی عیسوی کی فکری، دینی اور تہذیبی تاریخ بھی محفوظ ہوگئی ہے۔ یہ تصنیف ایک صاحبِ فکر عالم کی زندگی کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ اس عہد کے حالات وواقعات کی زندہ تصویر پیش کرتی ہے، اور قاری کو تاریخ، فکر اور تجربے کے ایک ہمہ گیر سفر پر لے جاتی ہے۔

(۱۰) پرانے چراغ

یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے، جس میں مولانا نے اپنے محسن اساتذہ ومشائخ، محبوب قائدین وزعماء، رفقا، عزیزوں، اور بعض مخلص، ذہین اور معاصر شخصیات کے دل آویز حالات کو اپنے ذاتی تاثرات، مشاہدات، واقعات اور مستند معلومات کے تناظر میں قلم بند کیا ہے۔ اس تصنیف کے ذریعے مجموعی طور پر ۶۹ ممتاز شخصیات سے صحیح اور بامعنی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ گراں قدر کتاب مکتبۂ فردوس لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے، اور اپنے اسلوب، مواد اور اثر انگیزی کے اعتبار سے سوانح نگاری کا ایک نہایت خوب صورت اور یادگار نمونہ ہے۔

(۱۱) نقوشِ اقبال

یہ کتاب عربی، اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہو

چکی ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اس تصنیف کے ذریعے مولانا نے علامہ اقبالؒ کی شاعری کے انقلاب انگیز اثرات کو نہایت بصیرت افروز انداز میں نمایاں کیا ہے، اور اقبال کے کلام سے استدلال کرتے ہوئے مغربی تہذیب و اقدار کے نقصانات اور عالمِ انسانیت کے لیے اس کے خطرناک نتائج کو واضح کیا ہے۔ یہ کتاب محض اقبالیات پر ایک علمی مطالعہ نہیں، بل کہ مشرقی فکر، اسلامی شعور اور تہذیبی خودآگہی کی ایک مؤثر دعوت بھی ہے، جو قاری کے ذہن و دل دونوں کو بیدار کرتی ہے۔

(۱۲) پاجا سراغِ زندگی

یہ کتاب طالبانِ علومِ نبوت کے سامنے کی گئی مؤثر تقریروں کا مجموعہ ہے، جس میں انہیں علم کے ساتھ عمل، عالمانہ وقار اور داعیانہ کردار کے ساتھ زندگی گزارنے کی پُرخلوص دعوت دی گئی ہے۔ ان خطبات میں طلبہ کو مقصدِ حیات کی پہچان، دینی ذمہ داریوں کے شعور اور عملی زندگی میں کردار کی استواری کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ کتاب محض نصیحتوں کا مجموعہ نہیں، بل کہ اہلِ علم کے لیے ایک فکری رہنمائی اور عملی زندگی کا واضح لائحۂ عمل پیش کرتی ہے۔

(۱۳) قرآنی افادات

اس کتاب میں مولانا کی تقریروں اور تحریروں میں بیان ہونے والے قرآنی حقائق، معانی اور مفاہیم کو یکجا کیا گیا ہے، اور ان کے ضمن میں پیش کی گئی دعوتِ فکر و عمل کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ قرآنِ کریم سے فکری و عملی رہنمائی حاصل کرنے کی ایک مؤثر کوشش ہے۔ یہ گراں قدر کتاب محمد الحسنی ٹرسٹ رائے بریلی کی جانب سے شائع کی گئی ہے، اور اپنے موضوع و اسلوب کے اعتبار سے اہلِ علم اور عام قارئین دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔

حوالہ جات

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی۔ ایک عہد ساز شخصیت مشاہدات وتجربات کی روشنی میں۔ از مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ۔

☆☆☆

مسلمانوں کی ترقی

''یورپ کا کوئی ماضی نہیں اس لیے وہ مستقبل کے اندھیروں میں جدھر چاہے ٹھوکریں کھاتا پھرے، لیکن اسلام کا ماضی اتنا شاندار ہے کہ مسلمانوں کی ترقی آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے میں ہے یہاں تک کہ ہٹتے ہٹتے خیرالقرون عہد صحابہ بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک تک جا پہنچیں۔''

(علامہ شبلی نعمانیؒ)

مولانا علی میاںؒ اور اہلِ کشمیر کے باہمی تعلقات و کشمیر کے اسفار

عتیق الرحمٰن نعمانی
عالیہ ثالثہ شریعہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے کشمیر سے تعلقات رسمی یا تعارفی نوعیت کے نہیں تھے، بل کہ یہ ایک گہرے روحانی، علمی اور تہذیبی رشتے پر قائم و دائم تھے۔ مولانا نے کشمیر کو اولیائے کرام کی سرزمین، دینی ورثے اور اخلاقی سادگی کا مرکز تصور کرتے ہوئے وہاں کے عوام و خواص کے اخلاص، محبت اور دین دوستی کو ہمیشہ سراہا۔ بعد کے ادوار میں کیے گئے اسفار خصوصاً ۱۹۸۱ء میں سرینگر اور پونچھ کے اسفار نے مولانا کے دعوتی و اصلاحی پیغام کو پوری وادی میں مؤثر انداز میں عام کیا۔ ان کے خطبات نے نوجوانوں میں اخلاقی بیداری، سیرت سازی، علمی شعور اور دینی وابستگی پیدا کی۔ حضرت مولانا کے نزدیک کشمیر صرف ایک جغرافیائی وادی نہیں تھی، بل کہ ایک ایسا خطہ تھا جو ایمان، کردار اور اخوت کے چراغ روشن کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ ہمارا یہ مضمون ان ہی گہرے تعلقات، مشاہدات اور اصلاحی خطبات اور ان کے اثرات کا تجزیاتی جائزہ پیش کرنے کی کوشش ہے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ برصغیر کے ممتاز مفکرین، مصلحین اور دینی قائدین میں شمار ہوتے ہیں، جن کے دل میں امتِ مسلمہ کا درد ہمیشہ موجزن رہا۔ آپ ایک نابغۂ روزگار اور جامع الصفات شخصیت تھے۔ آپ کی ہمہ جہت ذات، وسیع دعوتی اثرات اور ملت کے تئیں عمیق محبت سے آراستہ تھی۔ مولانا نہ صرف ہندوستان بل کہ پورے عالمِ اسلام کے لیے فکری رہنما تصور کیے جاتے تھے اور بلاشبہ رہنمائی کا ایک روشن مینار تھے۔ مولانا کی نگاہ ہمیشہ امت کی علمی و اخلاقی تعمیر پر مرکوز رہی، اور اسی وسیع مشن کے تحت انہوں نے متعدد ممالک اور خطوں کے اسفار کیے۔ ان اسفار میں وادیٔ کشمیر کا سفر ایک نمایاں باب کی حیثیت رکھتا ہے، جس نے مولانا کے فکری احساسات پر گہرا اثر چھوڑا۔ مولانا کے نزدیک کشمیر صرف ایک حسین وادی نہیں بل کہ ایک ایسا مرکز تھا جہاں اولیائے کرام کی یادگاریں، علم و دین کا نور اور اسلامی تہذیب کی لطیف خوشبو رچی بسی تھی۔

اہلِ کشمیر سے تعلقات:

حضرت مولانا کا اہلِ کشمیر سے تعلق محض سرسری ملاقاتوں یا عارضی روابط تک محدود نہ تھا، بل کہ یہ ایک ایسا گہرا روحانی، اخلاقی اور علمی رشتہ تھا جو باہمی محبت، احترام اور اخلاص کی مضبوط بنیادوں پر قائم و دائم تھا۔ مولانا اہلِ کشمیر کو امتِ مسلمہ کے اس قیمتی حصے کے طور پر دیکھتے تھے جس نے تاریخِ اسلام میں علم و عرفان کے بے شمار چراغ روشن کیے ہیں۔ حضرت مولانا کی نظر میں کشمیری عوام، وہاں کے علماء و مشائخ اور طلبہ ایک عظیم دینی سرمایہ تھے، جو صدیوں سے علم، اخلاق اور دین کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ یہی اوصاف مولانا کے دل میں ان کے لیے خاص مقام پیدا کرتے تھے۔

مولانا اہلِ کشمیر کے اخلاص اور باطنی قوت کو نہ صرف سراہتے تھے بل کہ اسے دعوت و اصلاح کے مؤثر وسائل میں شمار

کرتے تھے۔اسی طرح کشمیری عوام کی سادگی، دین سے وابستگی اور بے لوث محبت مولانا کے لیے ایک مستقل سبق تھی۔خود مولانا ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''یہ لوگ دلوں میں دین کی روشنی رکھتے ہیں، اور یہی روشنی انہیں ہر آزمائش میں قائم رکھتی ہے۔ میں نے کشمیری عوام میں جو خلوص، محبت اور علم دوستی دیکھی، وہ ہمیشہ میرے دل و دماغ میں روشن رہے گی۔''

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک کشمیری عوام اور علماء کی یہی خصوصیات مجموعی طور پر امتِ مسلمہ کی بقا و تقویت کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے فکر مند رہتے تھے کہ اگر اہلِ کشمیر اپنی دینی و تہذیبی شناخت پر قائم رہے تو یہ خطہ پورے عالمِ اسلام کے لیے ایک عملی نمونہ بن سکتا ہے۔اسی مقصد کے تحت انہوں نے نوجوانوں کی تربیت اور دینی شعور کے فروغ کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا۔

حضرت مولانا کا اہلِ کشمیر سے تعلق صرف رسمی حد تک محدود نہ تھا، بل کہ یہ حقیقی اخوت، باہمی محبت اور قلبی وابستگی کا رشتہ تھا جو ان کی تحریروں، خطبات اور مشاہدات میں بار بار جھلکتا ہے۔ ہر سفر میں انہوں نے کشمیری عوام کی محبت، سادگی اور دین دوستی کو نہایت تحسین اور عقیدت بھرے الفاظ میں یاد کیا۔ ایک خطاب میں مولانا فرماتے ہیں:

''قوموں کی بقا ظاہری مظاہر سے نہیں، بل کہ ایمان، اخلاق اور کردار کی مضبوط بنیادوں سے ہوتی ہے۔ میں کشمیر میں ان بنیادوں کی خوشبو محسوس کرتا ہوں، اور یہی خوشبو مجھے اہلِ کشمیر کے دلوں کے قریب لے آئی ہے۔''

کشمیر کے اسفار

حضرت مولانا کے کشمیر کے اسفار محض جغرافیائی نوعیت کے نہیں تھے، بل کہ وہ فکری و علمی مشاہدات سے بھرپور اور ہمہ گیر تجربات پر مشتمل تھے۔ ان اسفار کا مقصد رسمی تقاریب یا محض رسمی سفر نہیں تھا بل کہ اہلِ کشمیر کے دلوں میں علم، اخلاق اور دینی بیداری کو فروغ دینا تھا۔ ماہ نامہ راہ نجات کے بانی جناب آسی غلام محمد وانی اپنے سلسلہ ''صحبتے با اہل علم'' میں آپ کی کشمیر کے سفر پر کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''احقر نے مولانا علی میاںؒ کی صحبتوں سے دو بار استفادہ کیا ہے۔ پہلی بار جب ہم ایک دعوتی سفر کے دوران ان کی زیارت و ملاقات کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ گئے اور وہاں ان کے ساتھ مصافحہ کیا، اس وقت حضرت علی میاںؒ دو اہل عرب کے ساتھ کرسی نشین تھے۔ دوران ملاقات ہم سے پوچھا کہاں سے آئے ہو۔ ہم نے جواباً عرض کیا ہم کشمیر سے آئے ہیں۔ فرمایا جب واپس چلے جاؤ گے تو اپنے علاقے میں ایک مدرسہ کھولو اور پھر اس کو دیوبند یا ندوہ کے ساتھ مربوط رکھو۔''

پھر مزید آگے جا کر لکھتے ہیں:

''دوسری دفعہ جب مولانا کشمیر تشریف لائے تو ان کے دو بیانوں میں مجھے شریک ہونے کی توفیق اللہ نے عنایت فرمائی۔ پہلا بیان انہوں نے تبتی مسجد عیدگاہ سرینگر میں کیا (یہاں تبتی زبان بولنے والوں کی ایک بستی ہے اور یہ حضرات مولانا علی میاںؒ کے نہایت ہی قدر دان ہیں۔ کیوں کہ بے خانماں ہونے کے بعد انہوں نے ان کے بہت سارے بچوں کو ندوہ میں اچھی تعلیم دلائی، جس کے لیے یہ حضرات تہہ دل کے ساتھ مولانا کے مشکور و ممنون ہیں)۔ یہاں پر مولانا نے ایک دل چسپ تقریر فرمائی۔ انہوں نے بستی کے مسلمانوں کو نصیحت کی کہ آپ یہاں پر ایک وصلی نصب

کریں اور اس پر یہ عبارت تحریر کریں "ہم نے اپنے وطن تبت کو کیوں چھوڑا؟" اور پھر نیچے یہ جواب لکھیں کہ ہم نے یہ کام محض اپنے ایمان کو بچانے کے لیے کیا۔ پھر فرمایا میں آپ لوگوں کو ایسا کرنے کے لیے اس لیے کہتا ہوں تاکہ جب اس پر صبح و شام آپ کے نوجوانوں کی نظر پڑتی رہے گی تو ان کی یاد تازہ ہوتی رہے گی اور پھر وہ اپنا ایمان بچانے کی ہمیشہ فکر رکھیں گے۔

بیان کے بعد یہ اعلان ہوا کہ دوسری مجلس "سکہ ڈافر" کے قریب ایک بزرگ کے مکان پر ہوگی جن کا اسم گرامی غلام نبی نورانی صاحب ہے۔ ہم اسی ایڈریس (پتا) پر اس کے گھر پہنچے۔ یہاں ہم نے مرد و زن کا ایک ہجوم پایا، جن سے سارا مکان بھر گیا تھا۔ بہت ساری عورتیں پردے میں مولانا کا بیان سننے کے لیے آئیں تھیں۔ میرے شریک سفر ایک ہیڈ ماسٹر صاحب بھی تھے، جو علاقہ رفیع آباد شمالی کشمیر سے خالصتاً مولانا کا بیان سننے کے لیے آئے تھے۔ دونوں مجلسوں میں ہمیں مولانا کا بیان سننے کا موقع اللہ نے نصیب فرمایا اور رخصت ہونے کے وقت ہم دونوں ساتھیوں کو مولانا کا مصافحہ نصیب فرمایا۔ اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس کے بعد مولانا سرینگر سے بانڈی پورہ ایک بزرگ کوثر صاحب سے ملنے کے لیے چلے تھے۔ کشمیر سے واپس جانے کے بعد انہوں نے اپنے کشمیر کے سفر سے متعلق ایک کتاب لکھی جو شائع بھی ہوئی۔ اس سفر میں مولاناؒ نے جماعت اسلامی کے دفتر اور (سرینگر کے) تبلیغی مرکز "رنگر مسجد" میں بھی بیان کیا اور کشمیر میں دعوتی محنت کا آغاز ہونے پر نہایت ہی خوشی کا اظہار کیا تھا۔"

سرینگر کا تاریخی دورہ اور ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری:

۱۹۸۱ء کے اواخر میں کشمیر یونیورسٹی نے حضرت مولانا علی میاںؒ کو ڈاکٹریٹ (Doctor of Literature) کی اعزازی ڈگری دینے کا اعلان کیا۔ مولانا نے اس اعزاز کو محض تعلیمی افتخار نہیں بل کہ ایک دعوتی اور اصلاحی موقع سمجھا۔ انہوں نے اس شرط کے ساتھ شرکت قبول کی کہ تقریب خالص علمی و فکری نوعیت کی ہوگی اور اس میں کسی قسم کا سیاسی رنگ شامل نہیں ہوگا۔

چناں چہ ۲۹/اکتوبر ۱۹۸۱ء کو گورنر بی۔ کے۔ نہرو کی صدارت میں منعقدہ کنووکیشن (اجلاس) میں مولانا نے "معلم کا مقام اور اہلِ علم کی ذمہ داریاں" کے موضوع پر خطاب کیا۔ اس موقع پر انہوں نے فرمایا:

> "جامعات کا پہلا کام سیرت سازی ہے۔ علم کا مقصد محض روزگار نہیں بلکہ انسان سازی ہے۔ قوموں کی بقا کردار اور دیانت سے ہوتی ہے۔"

یہ خطاب اہلِ کشمیر کے لیے علمی اور فکری بیداری کا ذریعہ بنا۔ اس وقت کے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے بھی اس خطاب کو اہلِ کشمیر کے لیے فکری رہنمائی قرار دیا۔

مساجد اور علمی مراکز میں خطبات:

کنووکیشن کے بعد مولانا نے جامع مسجد سرینگر، انجمن نصرت اسلام ہال اور دیگر علمی مراکز میں متعدد خطبات کیے۔ ان خطبات میں انہوں نے اہلِ کشمیر کو ان کے دینی ورثے کی یاد دہانی کرائی اور اتحاد، دین کی حفاظت، اخلاق اور سیرت سازی پر خصوصی زور دیا۔ ایک خطاب میں مولانا نے فرمایا:

> "یہ وادی ان بزرگانِ دین کی امانت ہے جنہوں نے یہاں اسلام کی روشنی پھیلائی۔ اگر ہم نے غفلت، انتشار اور دنیا پرستی کو جگہ دی تو یہ باغِ اسلام

خزاں کا شکار ہو جائے گا۔ قومیں کثرت سے نہیں بلکہ کردار سے مضبوط ہوتی ہیں۔''

ان خطبات نے عوام الناس بالخصوص نوجوانوں میں دینی شعور اور فکری بیداری کو فروغ دیا۔

ضلع پونچھ کا تاریخی دورہ:

مولانا کے کشمیر کے اسفار میں پونچھ کا دورہ بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ علاقہ دینی غیرت، اخلاص اور سادگی کے حوالے سے معروف تھا۔ پونچھ کے عوام نے مولانا کا پرتپاک مگر خالص دینی جذبے کے ساتھ استقبال کیا۔ مولانا اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پونچھ کے مسلمانوں کا خلوص، سادگی اور ایمان کی پختگی میرے دل پر نقش ہو گئی۔ یہ لوگ محبت میں سچے، دل میں مخلص اور دین سے مضبوط وابستہ ہیں۔''

اس موقع پر مولانا نے نوجوانوں اور علماء کو دین، اخلاق اور تہذیب کی مضبوطی کی طرف توجہ دلائی۔ ان کے پیغامات نے علاقے میں علمی اور اخلاقی بیداری کو تقویت دی۔

اختتامیہ:

مندرجہ بالا تحریر سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور وادیٔ کشمیر کے مابین تعلق محض چند اسفار، خطبات یا رسمی ملاقاتوں تک محدود نہ تھا، بل کہ یہ ایک گہرے فکری ربط اور سنجیدہ علمی وابستگی کا مظہر تھا۔ مولانا علی میاںؒ نے کشمیر کو صرف ایک جغرافیائی خطہ نہیں سمجھا، بل کہ اسے امت کے ایک حساس فکری و تہذیبی مرکز کے طور پر دیکھا، جہاں علمی رہنمائی اور فکری استقامت کی اشد ضرورت تھی۔ ان کے اسفار، مشاہدات اور تحریری اشارات اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ کشمیر کے دینی، تعلیمی اور سماجی حالات سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ ان کی اصلاح واستحکام کے لیے فکری سطح پر سنجیدہ غور وفکر بھی رکھتے تھے۔ اس طرح مولانا علی میاںؒ اور اہلِ کشمیر کے تعلقات ایک ایسے علمی وفکری رشتے کی صورت میں سامنے آتے ہیں جو وقتی اثرات سے بالاتر اور دیرپا معنویت کا حامل ہے، اور جسے برِّصغیر کی علمی ودعوتی تاریخ میں ایک باوقار اور قابلِ مطالعہ باب کی حیثیت حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی بے لوث دعوتی مساعی، ان کی فکری بصیرت اور ان کے مخلصانہ پیغام کو شرفِ قبول عطا فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور ان کے علم واخلاص کے فیوض کو تا قیامت جاری رکھے۔

اللہ ربّ العزّت وادیٔ کشمیر کو ایمان کی تازگی، کردار کی پختگی اور علمی واخلاقی استقامت سے مالا مال رکھے، اور ہمیں بھی ان اکابر کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے حق، خیر اور اصلاح کے سفر میں اخلاص کے ساتھ ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یا ربّ العالمین!

ماٰخذ و مراجع

۱۔ سید ابوالحسن علی ندویؒ - کاروانِ زندگی، جلد سوم، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ

۲۔ سید ابوالحسن علی ندویؒ - تحفۂ کشمیر، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ

۳۔ تحفۂ تیس سالہ۔ مولانا غلام نبی کشمیری قاسمی

☆☆☆

مرشد الامت حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ

بہ حیثیت ادیب و مفکر

مدثر بشیر کشمیری
عالیہ رابعہ شریعہ

حصہ اول: حضرت مولانا بہ حیثیت ادیب:

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ عربی زبان و ادب کے بڑے ماہر اور رمز شناس شخصیات میں سے تھے، آپ صرف زبان کی نوک و پلک ہی سے واقف نہیں تھے بل کہ اس کے نبّاض تھے اور اس کے رموز و اسرار سے اچھی خاصی شناسائی رکھتے تھے۔ سیرت و تاریخ اور ادب و تنقید آپ کے موضوعات رہے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبۂ ادب عربی میں بہ حیثیت معاون مدرس ان کا تدریسی سفر شروع ہوا۔ پھر ۱۹۵۰ء میں تقریباً ایک سال تک حجاز میں قیام رہا۔ ۱۹۵۲ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے ادیبِ دوم مقرر کیے گئے اور ۱۹۵۵ء میں شعبۂ ادب عربی کے صدر بنائے گئے۔ یوں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ادیب کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا۔ آپ زندگی کی آخری سانس تک اپنے کام میں سرگرمِ عمل رہے، یوں طلبہ کی بڑی تعداد آپ سے بہرہ مند اور فیض یاب ہوتی رہی اور اپنے ادبی و فکری خوابیدہ صلاحیتوں کو صیقل کرتی رہی۔

باب اول: ادبی و لسانی افکار و نظریات:

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی زبان و ادب کے بڑے ماہر، دقیقہ سنج اور باریک بین تھے اور جستہ جستہ اپنے افکار و نظریات سے لعل و گوہر بکھیرتے رہتے تھے۔ اس باب میں ہم حضرت مولانا کے لسانی و ادبی افکار و نظریات کو حضرت مولانا ڈاکٹر فرمان ندوی کے ایک اقتباس کے حوالے سے قلم بند کرتے ہیں، اقتباس ملاحظہ ہو:

(۱) حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی زبان و بیان کی حلاوت سے سرشار تھے، فرمایا کرتے تھے: کہ زبان کو عام طور پر خشک موضوع سمجھا جاتا ہے لیکن دراصل اس سے شناسائی کے بعد اس کی لذت و حلاوت محسوس ہونے لگتی ہے۔

(۲) زبان کے سیکھنے کے تین درجے اور مراحل ہیں سننا، بولنا، لکھنا۔ یہ تینوں مراحل زبان و ادب کی بادہ پیمائی کے لیے اہم اور سنگ ہائے میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں تعلیم کے تینوں عناصر (طلبہ، اساتذہ اور نصاب تعلیم) کو صحیح طور پر بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔

(۳) زبان کے حوالے سے یہ نظریہ بھی قابل لحاظ ہے کہ زبان میں صرف الفاظ جاننا کافی نہیں بل کہ صحیح و بر موقع و محل استعمال بھی امر شدنی ہے۔

(۴) فرمایا کہ علم نام ہے معلومات کا۔ اور ادب مؤثر اندازِ بیان میں دست گاہ حاصل کرنے کا نام ہے۔

(۵) ادب کی دو قسمیں ہیں: ادب عام، جس میں ادبی خصوصیات کا غلبہ نہ ہو، دوسرا ادب خاص، جس میں ادبی خصوصیات ومحاسن کا بڑا اہتمام ہو۔

(۶) زبان بہت مؤثر ہوتی ہے، وہ ثقافت کا نمائندہ ہوتی۔ جس قوم کی زبان بدلتی ہے تو اس قوم وملت کی تہذیب وتمدن بھی ادبار وانحطاط کی شکار ہو جاتی ہے۔

(۷) فرمایا کہ مستند ادباء کی تحریریں پڑھی جائیں مثلا عبدالحمید بن یحیی الکاتب، جاحظ وغیرہ۔ ان کی کتابیں خالص عربیت کی ترجمان ہیں۔ ویسے ادبی لحاظ سے ۱۱۰ ہجری تک کا عہد خاص اہمیت کا حامل ہے کہ یہ زمانہ عجمی اثرات سے محفوظ ہے۔

(۹) عصر حاضر کے ادباء کے بارے میں فرمایا احمد امین مؤرخ بھی ہے اور ادیب بھی، ان کی ادبی خصوصیات ''حیاتی'' اور ''فيض الخاطر'' میں نمایاں ہے ''فجر الإسلام''، ''ضحى الإسلام'' اور ''ظهر الإسلام'' میں ان کی تاریخی خصوصیات وآثار کا غلبہ ہیں۔

(۱۰) فرمایا کہ متنبی، ابوتمام اور معری کے یہاں عقلیت پائی جاتی ہے، بحتری اور ابوفراس کے یہاں ادبیت پائی جاتی ہے، اس تناظر میں متنبی کا یہ جملہ قابل ذکر ہے ''أنا و أبو تمام حكيمان والشاعر هو البحتري.''

(۱۱) فرمایا کہ بعض علماء کو یہ کمال حاصل ہوتا ہے کہ حرفِ جر کے استعمال سے بڑے بڑے معانی پیدا کر دیتے ہیں، جاحظ اس لشکر میں مقدمۃ الجیش کی حیثیت رکھتا ہے۔

[تعمیر حیات، خصوصی شمارہ نمبر ۱۵-۱۸]

باب دوم: تصنیفات وتالیفات اور صدارتی ایوارڈ:

حضرت مولانا ایک پُرکار ادیب اور سیّال قلم کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے ہزاروں صفحات رقم کیے۔ ان کی تحریر کی سحر انگیزی، روانی اور شستگی قاری کے دل وذہن کو مطمئن کرتی ہے اور اسے ایک فکری اطمینان اور پختگی کا احساس بخشتی ہے۔ اصلاح نصاب کے سلسلے میں آپ نے بھی خامہ فرسائی کی، اسی طرح بہ طور خاص ۱۱/۹ کے واقعے کے بعد، جب مسلمان ممالک کے خلاف جھوٹے، گھناؤنے اور منظم پروپیگنڈے کی یلغار شروع ہوئی، تو آپ نے اپنی تحریر وتقریر کے ذریعے دبیز پردوں کے پیچھے اصلی کشت وخون کے راز کو طشت ازبام کیا۔

ذیل میں ہم ان کی چند اہم نگارشات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

(۱) منثورات من أدب العرب: یہ دراصل ''القراءة الراشدة'' اور مختارات کے درمیان اس خلا کے لیے نہر سویز کا کام کرتی ہے جس خلا کو حضرت مولانا نے ایک ادیب وماہر فن کی حیثیت سے محسوس کی۔

(۲) مختار الشعر العربي :

اس میں عربی شعراء کے اشعار کو مرتب کیا گیا ہے جس میں اسلامی وعباسی دور کے شعراء کے اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے۔

(۳) الأدب العربي بين عرض و نقد : ادب عربی کی تاریخ وتنقید پر حضرت مولانا کی ایک جامع کتاب جو ''بقامت کہتر بقیمت بہتر'' کی مصداق ہے، طوالت سے بچتے ہوئے ذیل میں ہم صرف آپ کی چند کتابوں کا ذکر کرتے ہیں۔

رہبر انسانیت، غبار کارواں، عالم اسلام اور سامراجی نظام، دین وادب، سمرقند وبخارا کی بازیافت، نقوش سیرت، دو مہینے امریکی میں، عربی میں أضواء على الأدب الإسلامي، العالم الإسلامي قضايا و حلول، تأملات في سورة يوسف وغيرها، أضواء علي الفقه الإسلامي، تاريخ الأدب العربي، سراجاً منيراً سيرة خاتم النبيين محمد صلى الله عليه وسلم.

غرض حضرت مولاناؒ نے تاریخ، ادب، اسلامیات، جغرافیہ، تعلیم وتربیت اور دیگر متعدد موضوعات پر قلم کے جوہر دکھائے، اور ہر دور میں امتِ مسلمہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو فکری وعملی رہنمائی کے ذریعے ساحلِ نجات سے ہم کنار کرنے کی مخلصانہ کوشش کرتے رہے۔ یہ تمام تالیفات وتصنیفات آپ کے قلم کی بارآوری کی ضامن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو عربی زبان وادب کی خدمات کے اعتراف میں صدارتی ایوارڈ (Presidential award) کے تمغے سے بھی نوازا گیا۔

باب سوم: البعث الاسلامی کی ادارت اور الرائد کا اجرا:

جس زمانے میں عرب قومیت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، اس کی قیادت جمال عبدالناصر کے ہاتھ میں تھی، اور پوری امتِ اسلامیہ بالخصوص عالمِ عرب فکری وتہذیبی بھٹکاؤ کا شکار ہو رہا تھا، ایسے نازک اور فیصلہ کن مرحلے پر ندوۃ العلماء نے قومیتِ عربیہ کے اس غیر اسلامی نقطۂ نظر کے مدمقابل اسلامی دعوت وفکر کو عام کرنے کی غرض سے ۱۹۵۵ء میں عربی ماہنامہ "البعث الإسلامي" جاری کیا۔ یہ رسالہ اسلامی فکر کی ترجمانی اور امت کو فکری اعتدال کی راہ پر لانے کی ایک بروقت، جرأت مندانہ اور مؤثر علمی کوشش ثابت ہوا۔ اس وقت توفیق ارزانی سے حضرت سید محمد الحسنی کی ادارت اور حضرت مولانا سعید الرحمن اعظمی کی معاونت سے مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی ندوی کی سرپرستی میں یہ رسالہ جاری ہوا اور بعد میں مولانا نے بھی اس کی ادارت کی ذمہ داری بہ حسن وخوبی انجام دی، لیکن دارالعلوم میں طلبہ کو معاصر عربی سے روشناس کرانے کے لیے ایک اور پرچے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حضرت مولانا چوں کہ طلبہ کی نفسیات سے بہ خوبی واقف تھے، لہٰذا پندرہ روزہ ''الرائد'' نامی پرچے کا اجرا ۱۹۵۹ء میں آپ کے ہاتھوں عمل میں آیا، اس پرچے نے عربی ادب کی خوب آبیاری کی اور الحمدللہ تا ہنوز یہ پرچہ ادباء وطلبہ کے دامنِ ادبیت کو گوہر آبدار سے بھر رہا ہے۔

حصہ دوم: حضرت مولانا بہ حیثیت مفکر:

حضرت مولانا کی ایک اہم خصوصیت حکمت وتدبر اور فکری اعتدال ہے۔ فرد، معاشرہ اور قوم وملت کی نفسیات سے واقف تھے۔ حالات کے نشیب وفراز میں قوم وملت کے سود وزیاں سے شناسائی رکھتے تھے۔ فکری اعتدال آپ کی نمایاں صفت تھی، جس کی مثال آج کے معاشرے میں شاذ ونادر ہے۔ ہر وقت ملت اسلامیہ کی رہنمائی، مردم سازی اور ذہنی وفکری رہنمائی کرتے رہتے تھے، ہندوستان اور مسلمان، اسلامی فقہ، تعلیم وتربیت، جغرافیہ تاریخ جیسے ادق موضوعات پر خوب خامہ فرسائی کی، چناں چہ آپ کی فکری اعتدال کی چند مثالیں ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

ہندوستان اور مسلمان:

ہندوستان جہاں صدیوں سے یہاں کے باشندے رواداری، بقائے باہم اور خوش گوار ماحول میں رہا کرتے تھے لیکن آج بدقسمتی سے نفرت وتشدد کے اسیر ہوتے جارہے ہیں، چناں چہ مسلمانان ہند کے قوانین اسلامیہ کے تحفظ ونفاذ کے لیے حضرت ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے امارت شرعیہ قائم کی تو حضرت مولانا نے بہار، اڑیسہ جھارکھنڈ کے علماء کرام وعمائدین کے نام مفصل خطوط تحریر کیے جن میں امارت شرعیہ کے امیر کے ماتحت زندگی گزارنا واجب وضروری قرار دیا، ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

جب کسی ملک پر غیر مسلموں کا استیلا وغلبہ ہو جائے تو وہاں کے مسلمانوں پر اپنی ملی زندگی کی استواری کے لیے اور شرعی نظام کے قیام وبقا کے خاطر امیر شریعت کا انتخاب واجب ہے۔ مسلمانوں کی انفرادی زہد وتقوی کے باوجود ان کی ملی زندگی غیر شرعی اور جاہلیت کی زندگی ہے جس سے نکلنا مسلمانان

ہند کا پہلا فریضہ ہے۔

[تعمیر حیات، شمارہ نمبر ۱۵-۱۸، صفحہ ۳۶۲].

فقہی اعتدال:

اسی طرح اسلامی فقہ میں تشدد اختلاف کو فرو کرنے اور اعتدال و میانہ روی اختیار کرنے پر بھی خاص توجہ مرکوز کرائی، چناں چہ ڈاکٹر علی احمد ندوی حضرت مولانا کی کتاب ”الفقه الإسلامية و مكانة الإجتهاد منه“ کے مقدمے میں رقم طراز ہے:

مؤلف نے اپنے ان مقالات میں موجودہ دور کے مسائل میں کسی خاص مسئلے پر غور فکر کرنے کی کوشش نہیں کی بل کہ ہر زمانے میں اجتہاد کی اہمیت کو اجاگر کیا اور چاروں مذاہب فقہیہ کی اجتہادی بنیادوں کو نمایاں کیا، نیز اپنے اکثر مقالات میں مسلمانوں کے درمیان مسلکی اختلاف کو دور کرنے کی کوشش کی جن کی بنیاد صرف نقطۂ نظر کا اختلاف ہے۔

ذرائع ابلاغ اور مسلمان:

میڈیا اور ذرائع ابلاغ کے متعلق دہلی میں ایک کانفرنس کے دوران خطاب میں فرمایا:

The day when muslims will hold command over media will definitely be a better day not only for muslims but also for the rest of the world . (Radiance views weekly, New Delhi 4th Mar. 2016).

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت مولانا ایک عبقری و ہمہ گیر شخصیت تھی، جن کی تحریر اور تقریر میں وہ گیرائی اور گہرائی تھی جس میں بیش بہا گوہر آب دار پنہاں ہیں۔ آپ نے ملت اسلامیہ اور افراد و اشخاص کی مردم سازی کے لیے اپنی زندگی وقف کی اور ہر آن بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے کر چلے۔

فجزاهُ اللهُ عنّا وعن جميعِ المسلمين خيرَ الجزاءِ، وأجزلَ عليه شآبيبَ رحمته۔

☆☆☆

نذرانۂ عقیدت در مفتی شمائل ندوی

نتیجۂ فکر: محمد انیس کشمیری

حق کی صدا سے باطل رسوا ہو گیا
حق کے سامنے ملحد لاجواب ہو گیا

شمائل کی زباں سے جلوۂ برہان کھلا
ملحد کا ہر فریب بے نقاب ہو گیا

یاسر کی رہبری تھی، تیاری میں کمال
یہ قافلہ دلیل سے ہالہ ہو گیا

یہ معرکۂ یقیں تھا، تاریخ بن گیا
اہلِ نظر کے دل کا وہ خواب ہو گیا

باطل کے سارے بت دلیلوں سے ٹوٹ گئے
ایمان دل میں اور بھی گہرا ہو گیا

انیس یہ معرکۂ علم و یقیں تھا
میدانِ فکر میں حق غالب ہو گیا

زیرِ نظر اشعار مفتی شمائل عبداللہ ندوی کے لیے بہ طورِ نذرانۂ عقیدت پیش ہے، جو ان کو گزشتہ ماہ ۲۰ر دسمبر ۲۰۲۵ء کے کامیاب مناظرے کی مناسبت سے لکھے گیے۔

مرشدالامت کی اہم تصنیفات اوران کامختصرتعارف

عمرجان بن غلام حسین نائک
عالیہ ثالثہ شریعہ

اللہ تعالیٰ نے علم وفضل کے لحاظ سے مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ کو منفرد شان عطا فرمائی تھی۔ آپ کا علمی وادبی ذوق بہت بلند تھا۔ یوں تو تاریخ، تعلیم، سیرت، ادب، جغرافیہ اور نقد وتحقیق جیسے موضوعات آپ کے دلچسپی کے میدان تھے، اوران سب پر کچھ نہ کچھ لکھا اور عمدہ لکھا؛ مگر زبان وادب جغرافیہ اور قرآن وسیرت سے خصوصی لگاؤ رہا۔ ان موضوعات پر آپ نے گراں قدر تصنیفات چھوڑیں، جن کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا اور ارباب مدارس نے ان میں سے بعض کو اپنے یہاں شامل نصاب کیا۔

آپ اردو وعربی کے ممتاز اہل قلم، ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ اس کے ساتھ صحافت وتجزیہ نگاری کا بھی بڑا ذوق پایا تھا۔ اور اس ذوق کا اظہار "الرائد"، "البعث الإسلامي" "تعمیر حیات" اور" کاروانِ ادب" جیسے علمی وادبی مجلّات میں اپنے قیمتی مضامین ومقالات کے ذریعے کرتے رہے۔ آپ کا اسلوبِ تحریر انتہائی آسان، نہایت سادہ مگر شگفتہ ومؤثر تھا۔ تکلف وتصنع سے پاک، زبان نہایت آسان اور سادہ استعمال ہونے کے باوجود اس میں ادب وانشاء کی تمام لطافتیں موجود ہوتیں۔

حضرت مرشدالامت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں جن پر بہ یک وقت روشنی ڈالنا ایک مشکل امر ہے۔ میرے مقالے کا عنوان ہے"حضرت مرشدالامت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ کی اہم تصنیفات اوران کا مختصر تعارف" اس لیے مولانا کی چند اہم تصانیف پیش خدمت ہے۔

(۱)"رہبرِ انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم"

یہ مولانا کی مشہور کتاب ہے، اس کے کئی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں، یہ کتاب ۱۰/ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں: حضرت آدم علیہ السلام، دینی راہنمائی بصورتِ نبوت، نبی کا کام اور پیغام پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں: چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کی حالت، یورپ کے ملکوں کا حال اوراس وقت کے مذاہب کا تعارف اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک کے حالات وتاریخ کو قلم بند کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت، ولادت اور نشونما کا زمانہ بیان کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں: وحی کا آغاز، بعثت اور دعوت وتبلیغ کا ذکر ہے۔ پانچویں باب میں: واقعہ معراج، بیعتِ عقبہ، اور ہجرت مدینہ کا تذکرہ ہے۔ چھٹے باب میں: مدینہ منورہ کا قیام اور اجتماعی نظام کا بیان ہے۔ ساتویں باب میں: حجۃ الوداع کا ذکر ہے۔ اٹھویں باب میں علالت ووفات کا ذکر ہے۔ نویں باب میں خصوصیات وشمائل وخصائلِ نبوی کا بیان ہے۔ آخری دسویں باب: میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے۔

سیرت کے موضوع پر یہ کتاب بہت ہی جامع ہے۔ کتاب کا مقصد بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا اس کے دیباچہ

میں لکھتے ہیں: "ادھر دو سال قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ اللعالمین، خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی شان میں یورپ کے بعض اہل فکر نے گستاخی اور شرانگیزی کا جو رویہ اختیار کیا، اس نے حضور ﷺ کے عاشقوں اور وفاداروں کو ایسا ہوشیار کر دیا کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، جگہ جگہ سیمینار ہوئے، اور آپ ﷺ کی سیرت طیبہ جو انسانی زندگی کے لیے خیر وفلاح و بہترین نمونہ اور انسانی زندگی کی عزت و برتری کے حصول کے لیے رہبر اعظم ہے، اس کو پیش کرنے کے لیے جگہ جگہ خیر پسند اہل قلم متحرک ہو گئے اور کتابیں تصنیف کی گئی اور نبی اعظم، رہبر انسانیت، اور رحمت عالم کی حیات طیبہ کے شان دار پہلو کو پیش کرنے لگے۔ یہ کام ہر زبان میں کیا گیا اور کیا جا رہا ہے۔ اس کی ایک کڑی، میری بھی ایک کوشش، "رہبر انسانیت" کے نام سے لائق کے اشاعت پذیر ہوئی جو کہ الحمدللہ پسند بھی کی گئی"۔ [مقدمہ]

کتاب کی خصوصیت اور اہمیت کے تعلق سے حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ کتاب کی زبان سلیس، عام فہم اور استدلال بھی علمی اور تحقیقی ہونے کے ساتھ عام فہم ہے۔ اس میں معاندین اور مخالفین کے ذہن کو سامنے رکھا گیا ہے، اور اس مجادلہ اسلوب کے بجائے حکیمانہ اور نفسیاتی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہ کتاب سیرت کے کتب خانے میں ایک اضافہ ہے۔ اور ضرورت ہے کہ کئی زبانوں میں نقل کی جائے جو غیر مسلم استعمال کرتے ہیں۔ اس سے امید ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو غلط تصورات ذہنوں میں ہیں وہ دور ہوں گے سیرت پر مختلف نقطۂ نظر سے کتابیں لکھی گئی لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل خصوصیت معلم معلم اخلاق معلم انسانیت اور رحمۃ للعالمین ہے اور اسی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی بعثت کا مقصد قرار دیا ہے"۔ (رہبر انسانیت، ص:۲۸)

(۲) "سیرت محمدی انسانیت کے لیے اعلیٰ نمونہ"

یہ کتاب ۴ صفحات پر مشتمل ہے:

(الف) سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(ب) سیرت پاک اہل ایمان کے لیے جامع و کامل نمونہ

(ج) عید میلاد النبی کا پیغام

(د) انسانیت کی عید

یہ چاروں مضامین اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ تمام مضامین بہت ہی معیاری قرآن وحدیث کی روشنی میں لکھے گئے ہیں۔ اس میں اردو زبان وادب کی چاشنی و شیرینی کا بھی احساس ہوتا ہے۔

مولانا نے سیرت پر بہت کام کیا ہے۔ اگر آپ کے سیرت کے کام کو دیکھا جائے تو آپ بہ حیثیت سیرت نگار تسلیم کیے جائیں گے۔ میرا یہ احساس ہے کہ مولانا کے اس کام کو ضرور کوئی اپنی تحقیق کا موضوع بنائے گا اور اس پر کام کرے گا۔

(۳) "قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبرِ کامل"

یہ کتاب ۳۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ قرآنیات کے باب میں ایک نیا اضافہ ہے۔ مقصد تالیف بیان کرتے ہوئے مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی رحمہ اللہ اس کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

"اس دور میں قرآن کریم کے خلاف بعض حلقوں سے تحریک چل رہی ہے، یہ دعوی کیا جا رہا ہے کہ قرآن جنگ اور تشدد سکھانے والی کتاب ہے۔ اس مقصد سے اُن آیات کا انتخاب کر کے اس دعوے کو پیش کیا گیا ہے جن میں ظلم واعتداء کی حالت میں اپنے دفاع کے لیے کارروائی کا حکم دیا گیا ہے۔ یورپ میں "فتنہ" نامی فلم بنائی گئی، اس لیے اس وقت ضرورت اس بات کی تھی اور ہے کہ قرآن کریم میں انسانیت کی فلاح و بہبود، انفرادی و اجتماعی زندگی کی رہنمائی کے لیے جو اصول بیان کیے گئے ہیں، ان کو

معاصر علمی انداز میں پیش کیا جائے۔ یہ قرآن کریم کا اہم ترین موضوع ہے اور قرآن کریم نے اس کا دعویٰ بھی کیا ہے کہ یہ کتاب "هدى للناس" "شفاء الصدور" "بيان للناس" ہے۔ضرورت تھی کہ قرآن مجید کے ان موضوعات پر روشنی ڈالی جائے جو انسانی زندگی اور اخلاق سے متعلق ہیں،قرآن کریم نے دوسرے مذاہب اور ان کے رہنماؤں کے بارے میں احترام اور ان کے ذکر میں احتیاط برتنے،اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جو اصول ہیں بیان کیے ہیں ان کو نمایاں کیا جائے اور شدید زیادتی اور ظلم کی حالت میں بھی صبر اور محتاط کارروائی کا جو حکم دیا ہے،اور عدل و انصاف کا دامن تھامے رکھنے کی تلقین کی ہے اس کو واضح کیا جائے۔ان مضامین سے دوسری مذہبی کتابیں خالی ہیں"۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ چوں کہ تحریک پیام انسانیت سے وابستہ تھے اس لیے ان کو غیر مسلموں سے تبادلہ خیال کرنے کا موقع بھی ملتا تھا اور قرآن کے بارے میں غلط فہمیوں کا ان کو اندازہ ہوا۔انہوں نے ضرورت محسوس کی کہ قرآن کریم کے وہ مضامین جو پروردگار عالم، رب کائنات پر ایمان و یقین، تخلیق انسان کا مقصد، اخروی اور دنیوی زندگی، خدائی تعلیمات و احکامات، انسانی زندگی اور باہم روابط اور انسانی اخلاق سے متعلق ہیں اور انسان کی طبیعت اور اس کے رجحانات و خواہشات سے متعلق ہیں ان کو تفصیل سے بیان کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ وہ صرف مسلمانوں کے لیے نہیں، بلکہ ہر انسان کے لیے رہنما اصول پیش کرتا ہے، اور ان اصولوں کو برتنے سے خوشگوار اور پرامن ماحول اور پرسکون قلب میسر ہوتا ہے۔مولانا کو درس قرآن کے دوران مضامین کی طرف توجہ ہوئی کہ قرآن کریم کے ان مضامین کو اردو داں طبقہ تک منتقل کریں اور پھر دوسری زبانوں میں بھی منتقل ہوں تاکہ غیر مسلم طبقہ بھی اس سے استفادہ کریں۔"

یہ کتاب کل گیارہ ابواب پر مشتمل ہے:

- پہلا باب قرآن مجید اور علم
- دوسرا باب قرآن مجید اور انسان
- تیسرا باب خالق کائنات کی تابع داری
- چوتھا باب انبیاء کرام کی بعثت
- پانچواں باب قرآن آخری کتاب ہدایت
- چھٹا باب فضائل قرآن
- ساتواں باب علوم ومباحث
- آٹھواں باب قرآن مجید کی اعجازی خصوصیت،نواں باب تعلیمات قرآن
- دسواں باب نبی آخرالزماں کا مقام
- گیارواں باب حسن سیرت و اخلاق حسنہ کے لیے قرآنی ہدایت

قرآنی علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب بڑی معنویت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ان لوگوں کو بھی اپنے مطالعے میں رکھنا چاہیے جو کہیں درس قرآن دیتے ہیں۔اس کا ساتویں باب کے علوم ومباحث تو ہر عالم کو ضرور پڑھنا چاہیے۔(تعمیر حیات)

(۴)"جزیرۃ العرب":

یہ کتاب جغرافیہ، تاریخ، تہذیب و ثقافت پر مشتمل ہے۔ جزیرہ نما عرب جس کا مرکزی خطہ علاقۂ حجاز ہے، جہاں سے اسلام کی اولین شعائیں نکلیں، یہ کن خطوں پر مشتمل ہے، عصر اول میں ان کی کیا خصوصیات رہی ہیں۔ان سب باتوں کا جغرافیائی اور ثقافتی جائزہ اس کتاب میں لیا گیا ہے۔ یہ کتاب ریسرچ میتھڑ (تحقیقی اسلوب) پر مکمل تیار کی گئی ہے۔اس کے اشارے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نے اس کتاب کی تیاری میں کس طرح سے کتابوں کے ماخذ اور جائے وقوع کا مطالعہ کیا ہوگا۔ یہ کتاب آپ کی بہت ہی جامع اور عربی و اردو

زبان میں بہت ہی نایاب ونادر ہے۔

(۵)"حالات حاضرہ اور مسلمان":

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ''لائق توجہ امورحالات حاضرہ کے پس منظر میں''، ہے اس کے تحت کئی مضامین ہیں۔ دوسرا باب دینی تعلیم اور مدارس کی اہمیت پر مشتمل ہے۔ تیسرا باب: ''مسلم پرسنل لا اور اصلاحی معاشرہ'' سے متعلق ہے۔

یہ کتاب ان مضامین اور خطبات پر مشتمل ہے جس میں صاحب مضامین نے گزشتہ دو تین سال کے دوران امت اسلامیہ کے حالات حاضرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے اسباب اور پھر مستقبل کی توقعات اور اس کی تعمیر، ملت کے لیے تقاضۂ وقت کے لحاظ سے مناسب طریقۂ کار کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مختلف موقعوں پر کیے گئے خطبات اور لکھے گئے مضامین ہیں۔ جنہیں کتابی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔۔

(۶) "منثورات من أدب العرب": یہ کتاب متنوع موضوعات پر تحریر کردہ عربی تصانیف کے ادبی شہ پاروں کا ایک بہترین مجموعہ ہے۔ ۴۸/اسباق اور ۱۹۰/صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اسلامی عہد سے عصر حاضر تک کے مختلف زمانوں کے ادبی نمونوں کو پیش کرتی ہے۔ اس کتاب پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بیش قیمت مقدمہ ہے۔ نیز مرتب کتاب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ کے قلم سے کلمۃ الجامع کے عنوان سے اس کتاب کو تیار کرنے کے مقاصد اور پس منظر پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ندوۃ العلماء نے نصاب تعلیم کی اصلاح اور اس میں مفید اضافوں کی جو تحریک چلائی تھی، یہ کتاب اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ طویل عرصے سے عربی ادب کی تعلیم میں جو جمود پایا جاتا تھا، یہ کتاب اس کو توڑتی ہے اور بتاتی ہے کہ عربی ادب صرف چند کتابوں میں محدود نہیں ہے بل کہ حدیث وسیرت، تاریخ ومغازی اور اہل قلم کی تالیفات کا جو عظیم ذخیرہ ہے، اس میں بھی ادب کے متنوع اور انمول نمونے پائے جاتے ہیں۔ یہ کتاب دینی ودنیوی، قدیم وجدید ہر نوع کی ادبی تحریروں کو پیش کرتی ہے۔ اس میں حدیث وسیرت کا ادب بھی ہے اور ادبا ومفکرین کا ادب بھی ہے۔ اس کتاب میں ابواعلیٰ قالی، ڈاکٹر طہ حسین، ابوالفرج اصفہانی، ابن جوزی، ابن خلکان، ابن تیمیہ، ابن قیم، احمد امین، مصطفی لطفی منفلوطی، ڈاکٹر مصطفی صبائی، وغیرہ کی علمی وفکری تحریریں پیش کی گئی ہیں، جو اسلوب وبیان اور فکر وبلاغت میں ان ادبی تحریروں سے بہ درجہ بہتر ہے، جن کی تعلیم ایک لمبے عرصے سے کئی عربی مدارس میں دی جاتی رہی ہے۔ یہ کتاب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ساتھ ساتھ کئی دینی وعصری جامعات میں داخل نصاب ہے۔ اس کی تالیف اور پہلی اشاعت ۱۳۷۷ھ میں ہوئی ہے"۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ کی مندرجہ بالا تصنیفات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ اسلاف کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ آپ اپنے پیش رو بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر صحیح فکر کی ترسیل میں مصروف تھے کہ قضا وقدر کے فیصلے کے مطابق داعی اجل کو لبیک کہنا پڑا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے"۔ (آمین)

☆☆☆

مرشدالامت-ایک بے مثال معلم، ایک رجال ساز استاد

مصدق سعید
عالیہ ثالثہ شریعہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ۲۹ رنومبر ۱۹۲۹ء کو رائے بریلی کے ایک قدیم اور علمی اعتبار سے نہایت معزز گاؤں دائرہ شاہ علم اللہ (مشہور بہ تکیہ کلاں) میں پیدا ہوئے۔ یہ بستی صدیوں سے علم وعرفان، تقویٰ وللّٰہیت، اور دعوت و اصلاح کا مرکز رہی ہے۔ اس کے بانی حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ تھے، جن کی نسل میں علم وعمل اور دینی حمیت کا ایک درخشاں سلسلہ قائم رہا۔ اسی خانوادۂ علم وعزیمت میں حضرت سید احمد شہیدؒ جیسی تاریخ ساز شخصیت جلوہ گر ہوئی، اور بعد کے دور میں مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی عالمی شہرت نے اس بستی کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرایا۔ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ان ہی کے خواہر زادہ اور علمی وفکری جانشین تھے۔

آپ ۱۹۴۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبۂ ادبِ عربی کے معاون استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ادیبِ دوم، ۱۹۵۵ء میں صدرِ شعبۂ عربی، اور ۱۹۷۰ء میں "كلية اللغة العربية" کے عمید کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ نے ادب، حدیث اور تفسیر کی تدریس کے ذریعے علمی دنیا کو گراں قدر خدمات پیش کیں۔ آپ کی متعدد تصانیف درسی نصاب کا حصہ بنیں، جن میں "منثورات"، "الأدب العربی" "جزیرۃ العرب" اور "معلم الانشاء ثالث" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت مولاناؒ کی شخصیت جامع الصفات تھی۔ آپ ایک عظیم مسلم مدبر قائد، مخلص داعی، صاحبِ طرز مصنف اور صاحبِ دل واعظ کے ساتھ ساتھ ایک باکمال استاد ومعلم تھے۔ خاندانی شرافت اور علمی وجاہت کے ساتھ ساتھ آپ اخلاقی عظمت کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ سیرت میں اخلاقِ نبویؐ کی جھلک نمایاں تھی، اور عملی زندگی میں آپ حدیثِ رسول ﷺ "خيركم من طال عمره و حسن عمله" کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ گفتار ونوشت میں غیر معمولی احتیاط برتتے: نہ زبان سے کوئی ایسا لفظ نکلتا جو مواخذے کا سبب بنے، اور نہ قلم سے کوئی ایسی سطر رقم ہوتی جس پر انگلی اٹھائی جا سکے۔ عجز وانکسار آپ کی شخصیت کا مستقل اور نمایاں وصف تھا۔

قرآنِ کریم نے منصبِ تعلیم کی حقیقت کو نہایت جامع انداز میں یوں واضح کیا ہے:

"وَ يُزَكِّيهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ."

اس آیت میں معلم کی دو بنیادی ذمہ داریوں (تزکیۂ نفس اور تعلیمِ کتاب وحکمت) کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ محض تدریسی فرائض نہیں، بل کہ معلم کی اصل پہچان اور اس کے منصب کا جوہر ہیں۔ استاد وارثِ نبوت ہوتا ہے، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد بھی یہی تھا کہ انسان کی فکر وعمل کی اصلاح ہو، اس کے باطن کی تطہیر ہو، اور اس کی عقل وشعور کو وحی کی روشنی میسر آئے۔ حضرت مولاناؒ کی ذات میں یہ دونوں پہلو (تعلیم اور تزکیہ) غیر معمولی توازن کے ساتھ جمع تھے۔

تدریسی امتیاز واسلوب

آپ طلبہ میں شوقِ علم بیدار کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ علم غیرت منداور خوددار ہوتا ہے؛ ذراسی بے توجہی محسوس کرے تو ہاتھ نہیں آتا۔علم اسی کو نصیب ہوتا ہے جو اس کے لیے محنت،صبر اور یکسوئی اختیار کرتا ہے۔آپ کی تدریس کا امتیاز یہ تھا کہ آپ محض ترجمہ اور تشریح پر اکتفا نہیں کرتے تھے،بل کہ الفاظ کے ذوق، اسالیبِ بیان کے فرق، اور زبان کی روح سے طلبہ کو آشنا کرتے تھے۔ساتھ ہی جدید اور سہل اسلوبِ تحریر کی طرف رہنمائی فرماتے، اور مشکل الفاظ کے غیر ضروری تکلف سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔آپ کا اصرار تھا کہ سہل اور رواں اسلوب ہی اثر پذیری کی اصل کنجی ہے۔

آپ کا تدریسی اسلوب نہایت حکیمانہ اور تدریجی تھا۔ ہر مرحلے میں طلبہ کی ذہنی سطح اور استعداد کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ طلبہ ہر مرحلے میں مطمئن اور مستفید رہتے، اور یہ آپ کی تدریسی بصیرت کی روشن دلیل ہے۔

عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بڑے انتظامی مناصب تدریسی ذوق کو متاثر کر دیتے ہیں، مگر حضرت مولاناؒ کے یہاں معاملہ اس کے برعکس تھا۔جتنی بڑی ذمہ داری ملی، اتنی ہی وابستگی کے ساتھ تدریس جاری رکھی۔ آپ کے علمی اور انتظامی فرائض میں کبھی تصادم پیدا نہیں ہوا، بل کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے تقویت کا سبب بنے۔ زمانۂ طالب علمی سے لے کر زندگی کے آخری ایام میں بھی کتاب سے آپ کا تعلق قائم رہا، اور درس و مطالعہ آپ کی زندگی کا لازمی جزر ہا۔

حضرت مولاناؒ خود کو قبل اس کے کہ کسی منصب سے پہچانے جاتے، استاد کہلوانا پسند کرتے تھے۔آپ فرمایا کرتے تھے (جیسا کہ آپ کے ایک شاگرد مولانا محمد ارشد ندوی نے نقل کیا ہے) کہ میں دراصل استاد ہوں، اور استاد ہی رہنا چاہتا ہوں؛ اسی حیثیت سے میں طلبہ کی نفسیات کو سمجھتا ہوں، جانتا ہوں کہ وہ کہاں اور کیوں لغزش کا شکار ہوتے ہیں، اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی کامیابی کے اسباب کیا ہیں۔ یہی شعور آپ کی تدریس کو محض درس گاہ تک محدود نہیں رہنے دیتا تھا، بل کہ وہ تربیت گاہ بن جاتی تھی۔

حضرت مولاناؒ کو طلبہ کی عملی زندگی کی بھی گہری فکر رہتی تھی۔ آپ اس حقیقت سے بہ خوبی واقف تھے کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد اصل امتحان شروع ہوتا ہے۔ اسی لیے آپ طلبہ کو باوقار زندگی گزارنے، عزتِ نفس کی حفاظت کرنے، اور حالات کا حوصلہ مندی سے مقابلہ کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ آپ کے نزدیک علمی وقار اسی وقت معتبر ہے جب وہ عملی وقار میں ڈھل جائے۔

ممتاز تلامذہ

آپ کے تلامذہ میں ایسے اہلِ علم حضرات شامل ہیں جنہوں نے علمی، فکری، ادبی، تدریسی اور دعوتی میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں اور دے رہے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حضرت مولاناؒ کا فیض آج بھی ان کے شاگردوں کے ذریعے دنیا کے مختلف گوشوں میں جاری وساری ہے۔

ان کے ممتاز تلامذہ میں ڈاکٹر مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی، مولانا تقی الدین ندوی، پروفیسر محسن عثمانی ندوی، شیخ عبدالوہاب حلبیؒ، مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ، مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہریؒ، مولانا تقی الدین فردوسی ندویؒ، شیخ مفتی نیاز احمد ندوی، مولانا احمد لاٹ ندوی، مولانا خالد غازی پوری، مولانا عبدالعزیز بھٹکلی، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام خان ندوی، محمد ناظم ندوی، مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی وغیرہ جیسے اساطین علم وفضل شامل ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی زندگی اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ علم جب اخلاص، اخلاق اور تزکیۂ نفس کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو وہ محض معلومات کا ذخیرہ

نہیں رہتا، بل کہ ایک زندہ اور مؤثر قوت بن جاتا ہے۔ آپ نے تدریس کو محض پیشہ نہیں، بل کہ عبادت سمجھ کر اختیار کیا، اور منصب و شہرت کے باوجود اپنے آپ کو ہمیشہ "استاذ" کہلانے پر مطمئن رکھا۔ آپ کی فکر میں اعتدال، عمل میں وقار، گفتار میں احتیاط اور کردار میں للّٰہیت نمایاں تھی۔ آپ نے ایسے شاگرد تیار کیے جو علم کے ساتھ ساتھ اخلاق و بصیرت سے بھی آراستہ تھے۔ ان تلامذہ کے ذریعے آپ کا علمی و تربیتی فیض آج بھی مختلف علمی، فکری، ادبی اور دعوتی میدانوں میں جاری ہے۔ بلا شبہ آپ ان نادر شخصیات میں سے تھے جن کی خاموش محنت، بے نمود خدمت اور بے لوث وابستگی نے ایک پورے عہد کی فکری تشکیل میں حصہ لیا، اور جن کا نقشِ قدم اہلِ علم کے لیے آج بھی مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

الغرض حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی پوری حیاتِ مستعار اس حقیقت کی روشن تعبیر ہے کہ جب علم، اخلاص، اخلاق اور تزکیۂ نفس ایک نقطے پر جمع ہو جائیں تو ایک ایسا باکمال معلم وجود میں آتا ہے جو افراد نہیں، نسلیں بناتا ہے۔ آپ نے درس و تدریس کو محض علم کی منتقلی تک محدود نہیں رکھا، بل کہ اسے فکری تہذیب، کردار کی تعمیر اور زندگی کی رہنمائی کا مؤثر ذریعہ بنا دیا۔ منصب، شہرت اور ذمہ داریوں کی کثرت کے باوجود ''استاذ'' ہونا آپ کی سب سے بڑی شناخت رہی، اور یہی نسبت آپ کی عظمت کا اصل عنوان ہے۔ آپ کے تیار کردہ تلامذہ، آپ کے متوازن فکر، سادہ اسلوب اور پاکیزہ مزاج کے امین بن کر آج بھی مختلف میدانوں میں علم و خیر کی شمعیں روشن کر رہے ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مولاناؒ کی ذات ایک فرد نہیں، بلکہ ایک زندہ انجمن تھی، جس کی روشنی وقت کی گردش کے باوجود ماند نہیں پڑی، اور اہلِ علم و دعوت کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ بنی رہے گی۔

اللہ تعالیٰ ملتِ اسلامیہ کو ایسے ربّانی علماء اور مخلص معلمین عطا فرماتا رہے، جو علم کو تزکیہ، فکر کو عمل اور گفتار کو کردار میں ڈھال سکیں، اور ہمیں بھی اس قافلۂ علم و ہدایت میں سچے اخلاص کے ساتھ شامل فرمالے۔ آمین یا ربّ العالمین!

☆☆☆

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر

ندوۃ العلماء کے مدرسہ یعنی دار العلوم میں حاضر ہوا کیوں کر کہوں کہ مدرسہ کا معائنہ کیا البتہ طلبہ کو دیکھا۔ دار المطالعہ میں طلبہ کے تیار کردہ اخبار دیکھنے میں آئے۔ حیرت ہوتی ہے کہ کم عمر طلبا اتنے عمدہ خیالات، اتنی اچھی عبارت میں ادا کرتے ہیں!!! خداوند توفیق دے کہ ہمیشہ اصلاح کی طرف متوجہ رہیں، اور غور و خوض کے بعد رائے نہایت آزاد مگر فروتنی اور ادب کے ساتھ ظاہر کریں۔

محمد علی

۲۰/اکتوبر ۱۹۲۵ء

مولانا سید بلال عبدالحی حسنی مدظلہ کی علمی اور ملی خدمات

اویس احمد

عالیہ رابعہ شریعہ

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنین ندویؒ کے برادر اکبر مولانا ڈاکٹر عبدالعلی کے حفیدِ اصغر اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے جانشین ہیں۔

ابتدائی تعلیم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی نگرانی میں گھر پر ہوئی اعلیٰ تعلیم عالمیت: دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو ۱۹۸۸ء میں کی پھر حضرت والا نے فضیلت بھی یہی پر ۱۹۹۹ء میں مکمل کی، والد ماجد یعنی مولانا محمد الحسنیؒ کے انتقال کے وقت آپ کی عمر تقریباً ۱۰ سال تھی۔ ان کے انتقال کے بعد سے مولانا موصوف کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی محبت وشفقت اور مکمل سرپرستی حاصل رہی۔ تعلیم وتربیت کے سلسلے میں مولانا کو اپنے برادر اکبر داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کی خصوصی نگرانی حاصل ہوئی۔ مولانا سید بلال عبدالحی حسنی حفظہ اللہ کے مطالعہ کا بنیادی محور ومرکز حضرت مفکر اسلامؒ کی ذات اور تصنیفات ہیں، یہی وجہ ہے کہ مولانا مدظلہ فکر ابوالحسن کے مکمل امین اور اس کا حسین پرتو ہیں، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد مولانا مدظلہ العالی حضرت مولانا کے جانشین مفکر ملت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنیؒ کے معتمد علیہ اور ان کے علمی دعوتی و انتظامی خدمات میں پوری طرح شریک رہے۔

تدریسی خدمات

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی صاحب مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں بہ حیثیت استادِ حدیث وعلومِ حدیث مقرر ہوئے۔ اسی مدرسے میں مشکوٰۃ شریف اور ترمذی شریف کی تدریس کے علاوہ علوم حدیث پر متعدد کتاب تصنیف کیں، جن میں ''حدیث کی روشنی'' اور ''مبادی و أصول فی علم حدیث الرسول'' کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ دونوں کتابیں مختلف مدارس وجامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔

ان کی مختلف موضوعات پر درج ذیل متعدد کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں: (۱) تحقیق وتعلیق (۲) تنویر الآفاق شرح تہذیب الاخلاق (۳) صحاح ستہ اور ان کے مصنفین (۴) أسوہ رحمت (۵) اطاعت رسول ﷺ (۶) غزوات رسول ﷺ (۷) حقوق رسول ﷺ (۸) آسان معانی قرآن۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں فکر اسلامی کا موضوع:

مولانا مدظلہ کا ایک نیک اور احسن عمل ''قرآن مجید کی خدمت'' کے تعلق سے منظر عام پر آیا (آسان معانی قرآن مختصر حواشی کے ساتھ) ابنائے ندوہ میں مولانا کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کا مکمل ترجمہ پیش کیا۔ یہ ترجمہ قرآن مجید کو آسان اور روزمرہ کی اردو زبان میں پیش کرتا ہے۔ تاکہ عام فہم لوگوں کے لیے اس کے معانی ومطالب کو سمجھنا سہل اور آسان ہوسکے۔ یہ ترجمہ نہایت سلیس اور آسان اسلوب میں ہونے کی وجہ سے مقبول عام ہے۔ مولانا نے قرآن مجید کی خدمت کا آغاز محض اللہ کے فضل وکرم سے جمعہ کے مبارک دن ۱۴ رشعبان المعظم

۱۴۲۹ ہجری کو مسجد حرام مکہ مکرمہ سے شروع کیا اور ۸ ر رمضان المبارک ۱۴۳۲ ہجری کو مسجد نبوی میں محض اللہ ہی کے فضل سے تکمیل کو پہنچا۔مولانا فرماتے ہیں کہ جن حضرات کو کلام الٰہی سے جتنی مناسبت اور صاحب کلام سے جتنی نسبت رہی ہے وہ اتنا ہی قریب پہنچا ہے اسی لیے اس کو عام طور پر ترجمہ قرآن کے بجائے ترجمہ معانی قرآن کہا جاتا ہے۔اس سلسلے میں سب سے پہلا اور نمایاں نام حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے،جن کا ترجمہ قرآن کے بعد تمام تراجم کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا سید بلال حسنی حفظہ اللہ نے اس عظیم کتاب کے ترجمہ کا آغاز اللہ کے پیارے نبی ﷺ کے وطن مکہ مکرمہ (مسجد حرام) سے کیا اور تکمیل مسجد نبوی میں ہوئی۔واقعتاً یہ اللہ کی رضا اور اس کی عنایت کا نتیجہ ہے،اس موضوع پر مولانا نے دیگر کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جن میں ''قرآن اور صاحب قرآن''اصلاحِ معاشرہ سورہ حجرات کی روشنی میں'' شائع ہو چکی ہیں۔

ملی خدمات

تحریک پیام انسانیت:

حضرت مولانا سید بلال عبدالحئی حسنی حفظہ اللہ اپنے برادر اکبر سید عبداللہ حسنی ندویؒ کی وفات کے بعد کل ہند تحریک پیام انسانیت کے معتمد عمومی منتخب کیے گئے۔مولانا موصوف کی انتھک کوششوں اور فکر مندی کے نتیجے میں آج ملک کے طول و عرض میں منظم طریقے پر پیام انسانیت کی خدمات کا کام جاری و ساری ہے۔تقریباً ہر شعبے اور ہر شہر میں پیام انسانیت سرگرم عمل ہے۔نیز مدرسہ ضیاء العلوم کے نائب ناظم اور اپنے والدؒ کے قائم کردہ ادارہ ''دارعرفات'' کے تحت ایک علمی و تحقیقی ادارہ ''مرکز الشيخ أبي الحسن الندوي رحمه الله'' کے مدیر ہیں۔بہ طور منتظم آپ نے مدرسہ ضیاء العلوم تکیہ کی برسوں خدمت کی اور اسے علم و اخلاق کے اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔جس منصب پر بھی فائز رہے اس کی شان آپ کے کردار و قیادت سے نکھر گئی۔یہ تحریک پورے ملک میں انسانیت،خدمت،اور اخلاقی بیداری کا علم بلند کیے ہوئے ہے،اسی تحریک پیام انسانیت کے تحت ملک بھر میں میڈیکل کیمپس منعقد کیے جا رہے ہیں، جہاں ہزاروں ضرورت مندوں کو مفت علاج اور دوائیں فراہم کی جا رہی ہیں۔خاص طور پر غریب بستیوں اور دیہاتیوں میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ کوئی بھی شخص غربت کی وجہ سے علاج سے محروم نہ ہو،تحریک کی تقریباً ۲۰۰ سے زائد ٹیمیں مستقل میدان عمل میں مصروف رہی ہیں۔

حضرت والا کی سرپرستی میں ''ہنگر فری انڈیا'' کے عنوان سے ایک وسیع فلاحی مہم جاری ہے جس کے تحت ملک کے مختلف علاقوں میں غریب،مفلس،اور بے سہارا لوگوں کو روزانہ کھانا فراہم کیا جا رہا ہے۔پیام انسانیات کے والنٹیئر (رضاکار) گاؤں گاؤں بستی بستی جا کر بھوک سے نجات دلانے اور دلوں کو جوڑنے کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔حضرت مولانا کی خصوصی توجہ نئی نسل کی تربیت اور کردار سازی پر ہے۔تحریک کے تحت شخصیت سازی اور اخلاقی بیداری پر پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔تاکہ نوجوانوں میں انسان دوستی،ایمانداری،اور اخلاقی کردار کو فروغ دیا جا سکے اس مہم کا مقصد یہ ہے کہ ہر نوجوان ایک بہتر انسان بنے اور اپنے خاندان سماج اور ملک کے لیے ایک روشنی کا مینار ہو۔

نشے سے پاک شہر۔محفوظ نسل محفوظ: مستقبل

آج ملک میں نئی نسل منشیات کے خطرے سے دو چار ہیں۔حضرت مولانا کی نگرانی میں تحریک پیام انسانیت نے ''نشے سے پاک شہر'' کے عنوان سے ایک قومی مہم شروع کی ہے، اس کے تحت اسکولوں،کالجوں،اور محلوں میں بیداری پروگرام ہو رہے ہیں،جن کے ذریعے سے نوجوانوں کو نشے کی لعنت سے دور رکھنے کی ترغیب دی جا رہی ہے اور الحمدللہ کئی علاقوں میں

نمایاں کامیابیاں دیکھنے کو ملی ہیں۔ حضرت مولانا سید بلال صاحب نے تحریک پیام انسانیت میں امن و بھائی چارے کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس تحریک کے زیر اہتمام مختلف شہروں میں ڈائلاگ کارنر اور بین المذاہب ملاقاتیں منعقد کی جارہی ہیں، جن میں مختلف مذاہب مکاتب فکر اور دانشور طبقہ شریک ہوتا ہے، ان نشستوں کا مقصد ملک میں امن محبت اور باہمی احترام کی فضا کو فروغ دینا ہے تاکہ انسان کو انسان سے جوڑنے والا پیغام عام ہو اور نفرتوں کی دیواریں ٹوٹ جائیں۔ یہ تحریک دلوں کو جوڑنے، نسلوں کو سنوارنے اور قوم کو اخلاقی بلندی کی طرف لے جانے کا نام ہے۔ اس تحریک کی ایک اور بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ رضا کاران مریضوں کے لیے خون عطیہ کرتے ہیں، جنھیں فوری طور ضرورت ہوتی ہے تاکہ زندگی کو بچایا جاسکے۔ یہی جذبہ انسانیت کے اصل مفہوم کو زندہ کرتا ہے۔

تحریک پیام انسانیت کے اغراض و مقاصد

اس تنظیم کے اغراض و مقاصد یہ ہیں: عمومی طور پر نوع انسانی کی بھلائی، بھائی چارہ پر مبنی خالصتاً انسانی اور قومی سطح پر باہمی خوش اعتمادی، اور محبت اور ہمدردی کا ایک ماحول پیدا کرنا۔ تشدد، لاقانونیت، اخلاقی پستی کا خاتمہ اور ایک دوسرے کے تئیں ساتھی ہونے کا احساس پیدا کرنا۔ بنی نوع انسانی کے دکھ اور تکالیف بانٹنے کے احساس کو عام کرنے کے لیے جلسوں اور سیمیناروں کا انعقاد کرنا۔

۲۔ مختلف قومی، علاقائی اور وسیع پیمانے پر بولی جانے والی زبانوں میں مفید ثقافتی ادب کی اشاعت۔ خدمت اور قربانی کے ذریعہ مختلف برادریوں اور طبقات کے لوگوں کو ایک ساتھ لانا۔ جو زندگی سے بیزار ہوچکے ہیں ان میں اعتماد بحال کرنا۔ روحانی طور پر مردہ روحوں میں زندگی کا احیاء اور بحالی اور انہیں زندگی کا صالح مقصد دینا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید بلال حسنی مدظلہ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس عاملہ نے ناظم اعلیٰ منتخب کیا، انٹرنیشنل یونین آف مسلم اسکالرز کے ساتھ کئی اہم شخصیات اور تنظیموں نے حضرت مولانا سید بلال صاحب کو اپنی مخلصانہ مبارک باد اور دعائیں پیش کیں۔ جب سے حضرت والا ناظم اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے تب سے حضرت والا نے ادارے کی تعمیر و ترقی کو اپنی اولین ترجیح بنایا۔

حضرت والا کی دیگر مشغولیات اور مناصب

۱۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سکریٹری کے طور پر ملت کے اہم مسائل میں رہنمائی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

۲۔ دار عرفات تکیہ کلاں، رائے بریلی کے جنرل سکریٹری اور ماہنامہ پیام عرفات (اردو/ ہندی) کے ایڈیٹر کی حیثیت سے علمی و فکری خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۳۔ مرکزی حج کمیٹی آف انڈیا کے سابق رکن رہ چکے ہیں، اسی طرح متعدد مدارس و جامعات اور دینی و فلاحی تنظیموں کے سرپرست و نگران ہیں۔

حضرت مولانا بلال صاحب نے کئی عرب اور اسلامی ممالک کا دورہ کیا۔ علمی و ادبی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت بھی کرتے ہیں، حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ کی بہت سے علمی و تحقیقی مضامین اور مقالہ جو رسائل اور اخبارات میں شائع ہوئے ہیں اور ان میں سے کچھ سیمیناروں اور کانفرنسوں میں بھی پیش کیے گئے ہیں۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

☆☆☆

جمعیت طلاب جموں و کشمیر-تعارف و سرگرمیاں

طلحہ نذیر ندوی (تدریب افتاء)
محمد انیس کشمیری (عالیہ رابعہ شریعہ)

تعارف اور اغراض و مقاصد

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے دورۂ کشمیر کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں جموں و کشمیر کے طلبہ کے داخلے کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا، اور دیکھتے ہی دیکھتے ریاست کی کثیر تعداد طلبہ زیورِ علم سے آراستہ ہونے کے لیے ندوۃ العلماء کا رخ کرنے لگے۔

طلبہ کی اس مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھتے ہوئے جموں و کشمیر کے بعض فکرمند سینئر طلبہ نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ان طلبہ کو ایک منظم اور مشترک پلیٹ فارم پر جمع کیا جانا چاہیے، تاکہ باہمی رابطہ مضبوط ہو، اور تعلیمی و فکری میدان میں ایک دوسرے کے لیے تعاون اور رہنمائی کا مؤثر ذریعہ بن سکیں۔

اغراض و مقاصد:

جمعیت طلاب جموں و کشمیر کے تین مقاصد ہیں:

(۱) تعلیمی رہنمائی

(۲) مالی کمزوری اور بیماری سے دوچار طلبہ کی اعانت

(۳) گاہے بہ گاہے تربیتی نشستوں کا انعقاد

دار العلوم میں ہر سال بعض جدید طلبہ کو ابتدائی درجات میں درسی کتابیں سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے، جس کے نتیجے میں وہ درسیات میں کمزور رہ جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال کے تدارک کے لیے جمعیت کے ذمہ دار اپنے صوبے کے سندی درجات کے باصلاحیت ساتھیوں کی معاونت سے، ان کے فارغ اوقات میں کمزور طلبہ کے لیے باقاعدہ ٹیوشن (اضافی کلاس) کا انتظام کرتے ہیں۔ وہ ساتھی ان مخصوص کتابوں کو باقاعدہ درساً پڑھاتے ہیں اور اس طرح ان طلبہ کی درسی کمزوریوں کو دور کرنے کی مؤثر کوشش کی جاتی ہے۔

مالی اعتبار سے کمزور طلبہ کو جمعیت کی جانب سے بہ قدرِ ضرورت مالی امداد فراہم کی جاتی ہے، اور بیمار طلبہ کی عیادت و معاونت کے لیے ہر ہوسٹل میں مخصوص ذمہ دار مقرر کیے جاتے ہیں، تاکہ بروقت تعاون ممکن ہو سکے۔

جمعیت کے بنیادی مقاصد میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ اپنے صوبے کے تمام رفقا کو یکجا کر کے کسی صاحبِ علم استاد سے تعلیمی رہنمائی اور پند و نصائح حاصل کی جائیں، بالخصوص جب کشمیر سے کوئی اہلِ علم شخصیت ندوہ تشریف لائے تو ان کے علمی و فکری افادات سے استفادے کے لیے باقاعدہ درخواست کر کے ایک تربیتی مجلس منعقد کی جاتی ہے۔ ان نشستوں کا مقصد طلبہ کی تعلیمی رہنمائی کے ساتھ ساتھ علمی و فکری نشوونما، سیرت و کردار کی اصلاح اور اخلاقی تربیت ہے، تاکہ وہ اپنے صوبے کے نازک حالات، ضروری تقاضوں اور آئندہ پیش آنے والے چیلنجز سے باخبر رہیں اور ان کا سامنا کرنے کے لیے بہتر طور پر تیار ہو سکیں۔

چناں چہ ان ہی مقاصد اور ضرورت کے پیشِ نظر ''جمعیت طلاب جموں و کشمیر'' وجود میں لائی گئی۔ یہاں یہ بات واضح رہنی ضروری ہے کہ یہ جمعیت دار العلوم ندوۃ العلماء

میں قائم طلبہ کی ''جمعیت الاصلاح'' کے متوازی و بالمقابل جمعیۃ بالکل بھی نہیں ہے بل کہ یہ صرف ایک صوبے کے طلبہ کو تعلیمی رہنمائی اور دیگر ضروری امور میں مربوط و منسلک رکھنے کے مقصد کے لیے تشکیل دی گئی ہے۔

تاریخی پس منظر

جمعیت کی بنیاد کس سن میں رکھی گئی، اس کا حتمی تعین ممکن نہیں، کیوں کہ اس سلسلے میں کوئی باضابطہ یا مستند ریکارڈ دستیاب نہیں ہے۔ تاہم اس جمعیت کے پلیٹ فارم سے سالانہ مجلّے کی صورت میں طلبۂ جموں و کشمیر کی علمی و فکری سرگرمیوں کے دو مجموعے ''ردِفتنۂ قادیانیت'' اور ''سیادت و قیادت'' کے عنوان پر شائع ہو چکے ہیں، جو اس جمعیت کی فعالیت اور فکری بیداری کے واضح شواہد ہیں۔

بعد میں ایک طویل عرصے تک یہ پلیٹ فارم کمزوری کا شکار رہا، یہاں تک کہ کووِڈ-۱۹ نے تعلیمی نظام کو شدید طور پر متاثر کیا۔ کووِڈ-۱۹ کے بعد صورتِ حال یہ تھی کہ چند گنے چنے طلبہ کے علاوہ تقریباً تمام طلبہ نئے تھے اور وہ جمعیت کے نظام، اس کی تاریخ اور اس کے مقاصد سے ناواقف تھے۔ ایسے نازک مرحلے پر داؤد بشیر وار ندوی نے جمعیت کے اس پلیٹ فارم کو سنبھالا۔ اس دوران مولانا سجاد حسین صاحب ندوی (مہتمم جامعہ ریاض الصالحین، بوٹینگو سوپور کشمیر) نے رواقِ ابوالحسن زیریں کے ہال میں جموں و کشمیر کے طلبہ سے ایک مؤثر خطاب فرمایا، اور خطاب کے اختتام پر داؤد بشیر وار کو جمعیتِ طلابِ جموں و کشمیر کا ناظم، سجاد احمد ملہ اور راقم الحروف طلحہ نذیر کو نائبین، اور جہانگیر احمد راتھر کو خزانچی (معتمد مالیات) طے کیے جانے کا اعلان فرمایا۔

ایک سال گزرنے کے بعد ۲۰۲۳ء میں جمعیت کی قیادت راقم الحروف (طلحہ نذیر) کے سپرد کی گئی، جب کہ نائبین کے طور پر عابد ثناء اللہ اور عادل قیوم منتخب ہوئے۔ اس سال کچھ سینئر طلبہ کو ذمہ داری دی گئی کہ وہ خصوصی اول کے طلبہ کو خاص طور پر اور باقی طلبہ کو عموماً نحو و صرف اور انشاء پڑھائیں، تاکہ ان کی تعلیمی استعداد و صلاحیت کمزور نہ رہے۔ خصوصی ثانی کے نصاب میں مختصر القدوری کو اسی سال خارج کیا گیا تھا، جمعیت کے ذمہ داروں نے محسوس کیا کہ ہدایہ کو سمجھنے کے لیے مختصر القدوری پڑھنا ضروری ہے اور الحمدللہ راقم الحروف نے مختصر القدوری پڑھانے کا سلسلہ بھی شروع کیا، جس میں جموں و کشمیر کے علاوہ بیرون ریاست کے طلبہ نے بھی شرکت کی۔ اسی سال پہلی مرتبہ فارغین کے اعزاز میں ایک باوقار جلسے کا انعقاد عمل میں آیا۔

اس کے بعد ۲۰۲۴ء میں راقم نے بابر بشیر خان کو جمعیت کا ناظم نامزد کیا، ان پر تمام طلبہ نے اتفاقِ رائے کا اظہار کیا، اور راقم الحروف نے نائب کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس سال تعلیمی سرگرمیوں میں ایک اضافہ یہ بھی ہوا کہ مختصر القدوری کے ساتھ ساتھ بعض طلبہ کے لیے ہدایہ اول کا درس بھی شروع کیا گیا اور اس کی ذمہ داری بھی راقم الحروف (طلحہ نذیر) نے ہی اٹھائی فالحمد لله على ذلك. اس سال دوبارہ مجلہ شائع کرنے کا پروگرام تشکیل پایا، اور ''شاہِ ہمدان'' کے نام سے طلبۂ جموں و کشمیر کے مضامین پر مشتمل ایک علمی مجموعہ منظرِ عام پر آیا۔ مجلہ کا نام ''شاہ ہمدان'' اس عاجز ہی کا تجویز کردہ ہے۔

رواں سال ۱۴۴۷ (بہ مطابق ۲۰۲۵-۲۶) ندوۃ العلماء میں سب سے سینئر طالب علم ہونے کی حیثیت سے راقم الحروف نے پہلے سندی درجات کے طلبہ کو جمع کیا گیا اور جمعیت کی نظامت کے حوالے سے مشاورت کی۔ تمام سندی درجات کے طلبہ نے اتفاقِ رائے سے صدارت کی ذمہ داری راقم (طلحہ نذیر) کے ناتواں کندھوں پر رکھ دی۔ اس موقع پر جمعیت طلاب جموں و کشمیر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کمپیوٹرائزڈ پرچیاں تیار کروائی گئیں، جن پر نظامت کے تین امیدواروں کے نام درج تھے۔

۲۷/اپریل ۲۰۲۵ء کو انتخابی کاروائی نہایت خوش اسلوبی سے انجام پائی جس میں تقریباً ۱۲۰ طلبہ نے حصہ لیا، انتخابی نتائج کے مطابق محمد انیس الرحمن جمعیت کے ناظم منتخب ہوئے، جب کہ شمشاد احمد خان نائبِ اوّل اور جہانگیر فیاض نائبِ دوم منتخب ہوئے۔

تعلیمی سرگرمیاں:

امسال جمعیت کی طرف سے مجموعی طور پر چار سینئر ساتھی ٹیوشن کلاسیں (اضافی کلاسیں) پابندی کے ساتھ پڑھاتے رہے۔ ان اضافی کلاسوں کی پابندی اور افادیت کو دیکھتے ہوئے متعدد غیر صوبائی طلبہ بھی باقاعدگی سے ان دروس میں شریک ہو کر استفادہ کرتے رہے۔ گزشتہ برسوں کے مقابلے میں اس سال پڑھائی جانے والی کتابوں میں مزید کتابوں کا اضافہ ہوا۔ ان کی تفصیلات ذیل کے جدول میں دیکھی جا سکتی ہے:

نمبر شمار	کتاب برائے تدریس	اسم استاد	مستفید طلبہ کی تعداد
۱	مقدمہ مشکوٰۃ مکمل	طلحہ نذیر	۱۰
۲	سراجی	شمشاد احمد خان	۱۵
۳	ہدایہ اول	طلحہ نذیر	۱۰
۴	ہدایہ ثانی وثالث	طلحہ نذیر	۱۰
۵	مختصر القدوری	ذاکر حسین بٹ	۱۰
۶	عربی ادب وتعبیر	شمشاد احمد خان	۱۵
۷	نحو وصرف	رضوان منظور	۶

تربیتی مجالس

امسال ریاست کے ایک نوجوان اور باصلاحیت عالمِ دین: ڈاکٹر مولانا اصغر محمود ندوی (پروفیسر، شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی) لکھنؤ تشریف لائے۔ ان سے پند و نصائح کی درخواست کی گئی، جسے انہوں نے قبول فرما کر ۲۷/جولائی کو نمازِ عشاء کے بعد مجلس کے انعقاد پر آمادگی ظاہر کی۔ تاہم شہر میں شدید ٹریفک جام کے نتیجے میں موصوف وقت مقررہ پر پہنچ نہ سکے۔ اس وجہ سے یہ تربیتی نشست منسوخ کرنا پڑی۔

اجازتِ حدیث کی نشست

دارالعلوم کے شعبۂ ''تحقیقاتِ شرعیہ'' کے زیرِ اہتمام ۲۷ اور ۲۸ ستمبر ۲۰۲۵ء کو فقہی سیمینار منعقد ہوا، جس میں وادئ کشمیر کے معروف عالمِ دین حضرت مفتی نذیر احمد صاحب دامت برکاتہم (شیخ الحدیث وصدر مفتی دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ) مدعو تھے۔ اس قیمتی موقع کو غنیمت جانتے ہوئے طلبہ کی شدید فرمائش پر جمعیت کے ذمہ داروں نے حضرت مفتی صاحب سے اجازتِ حدیث کی درخواست کی، جسے آپ نے خوش دلی سے قبول فرمالیا۔

چناں چہ ۲۷/ستمبر ۲۰۲۵ء کو بعد نمازِ عصر مسجد کے تہہ خانے میں اجازتِ حدیث کی یہ مختصر مگر بابرکت نشست منعقد ہوئی۔ حضرت مفتی صاحب نے ابتدا میں اپنے مخصوص اور مؤثر انداز میں حدیث، علومِ حدیث اور تدوینِ حدیث پر نہایت پرمغز گفتگو فرمائی۔ اس کے بعد صحیح بخاری کی پہلی اور آخری حدیث پڑھ کر مجلس میں موجود سندی درجات کے طلبہ کو اپنی تمام اسناد سے اجازتِ حدیث مرحمت فرمائی۔ آخر میں حضرت مفتی صاحب کی دعا پر یہ روح پرور نشست اختتام پذیر ہوئی۔

اپنے ساؤنڈ سسٹم اور مائیک کا انتظام:

تربیتی مجالس کے انعقاد کے لیے اب تک ساؤنڈ سسٹم اور مائیک کا انتظام عموماً عاریتاً کرنا پڑتا تھا، جس کے لیے ہر بار دوسروں سے رجوع کرنا ناگزیر ہوجاتا تھا۔ تاہم اس مرتبہ صوبائی ساتھیوں نے باہمی تعاون اور ذاتی جذبۂ خدمت سے اپنی طرف سے رقم جمع کر کے مستقل معیاری ساؤنڈ سسٹم اور مائیک خرید لیے۔ اس خوش آئند اقدام کے نتیجے میں نہ صرف آئندہ مجالس

کے انتظام میں سہولت پیدا ہوگئی، بل کہ جمعیت بار بار دوسروں سے مائیک اور ساؤنڈ سسٹم مستعار لینے سے بھی مستغنی ہوگئی۔

ساتھیوں کی طبی اور دیگر معاونت:

سال کے دوران بعض طلبہ کو علالت کا سامنا رہا، ان کی بیمار پرسی کے لیے جمعیت کی جانب سے ہر ہاسٹل میں ذمہ دار مقرر کیے گئے ہیں، جو بروقت رابطہ، بیمار ساتھیوں کی عیادت، اسپتال تک رسائی اور علاج و معالجے سے متعلق ضروری انتظامات کی انجام دہی کو یقینی بناتے رہے۔

مزید برآں، ضرورت مند ساتھیوں کو نہ صرف طبی ضروریات کے لیے اعانت فراہم کی گئی، بل کہ علاج و معالجے اور دیگر ناگزیر اخراجات کے لیے مالی تعاون بھی دیا گیا۔ اس سلسلے میں امسال مجموعی طور پر ۲۱ ہزار روپے خرچ ہوئے، جو جمعیت کے اراکین اور ساتھیوں کی باہمی اعانت اور رضاکارانہ تعاون سے فراہم کیے گئے۔

صحافتی سرگرمیوں کے لیے رہنمائی:

دارالعلوم کی مرکزی اور مختلف ہوسٹلوں کی ''جمعیۃ الاصلاح'' کی بزم صحافت کے زیر اہتمام مختلف زبانوں میں باقاعدہ جداریے نکلتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ہماری جمعیت (جمعیت طلاب جموں و کشمیر) نے رواں سال اپنے صوبائی ساتھیوں کو الاصلاح کی بزم صحافت کے تحت اپنا جداریہ نکالنے کی ترغیب دی۔ اس ترغیب کے نتیجے میں صوبائی ساتھیوں کی جانب سے عربی میں ۱، اردو میں ۱ اور انگریزی میں ۲ رجداری پرچے منظرِ عام پر آئے، جو طلبہ کی صحافتی دلچسپی، فکری بیداری اور لسانی تنوع کا روشن ثبوت ہیں۔

اسی طرح رواں سال (۱۴۴۷ھ بہ مطابق ۲۰۲۵ء) ''نُظَمائے ندوۃ العلماء کی علمی وفکری خدمات'' کے عنوان پر مشتمل ایک خصوصی شمارہ اشاعت کے مراحل طے کر کے اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ مجلہ جمعیت کی علمی ذوق وفکری بیداری کا ایک خوش آئند مظہر ہے۔

عید کی صبح اجتماعی ناشتہ

ہر سال بقرعید کی مختصر تعطیلات میں طلبہ کی ایک بڑی تعداد گھر جانے کے بجائے دارالعلوم میں قیام کو ترجیح دیتی ہے۔ اسی تناظر میں امسال عید کی صبح دارالعلوم میں مقیم ساتھیوں کے لیے جمعیت کی جانب سے اجتماعی ناشتہ کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ چناں چہ ساتھیوں سے حسبِ استطاعت تعاون کی اپیل کی گئی، جس کے نتیجے میں کچھ رقم جمع ہوگئی، ساتھ میں ناظمِ جمعیت کے غیر معمولی ذاتی مالی تعاون سے ایک شان دار ناشتہ کی ضیافت کا انتظام ممکن ہوسکا۔ صدرِ جمعیت (طلحہ نذیر ندوی) کی نگرانی میں نمازِ عید کے بعد یہ پُررونق اجتماعی محفلِ ضیافت رواق مونگیری میں منعقد ہوئی، جس میں ساتھیوں نے اپنے ہم وطن طلبہ کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر ناشتہ تناول کیا اور باہمی محبت، اخوت اور عید کی خوشیوں سے بھرپور لطف اٹھایا۔ یوں یہ اجتماعی ضیافت جمعیت کے باہمی تعاون، تنظیمی نظم اور اخوتِ اسلامی کے عملی اظہار کا ایک خوش آئند اور یادگار مظہر ثابت ہوئی۔

☆☆☆

فہرست نظمائے جمعیت طلبہ جموں وکشمیر

نمبر شمار	اسمائے گرامی	سکونت	سنہ
۱	داؤد بشیر وار	کپواڑہ	۲۰۲۲-۲۳ء
۲	طلحہ نذیر	کولگام	۲۰۲۳-۲۴ء
۳	بابر بشیر	کپواڑہ	۲۰۲۴-۲۵ء
۴	محمد انیس الرحمٰن	سرینگر	۲۰۲۵-۲۶ء

فہرست معاونینِ ناظم واراکین

نمبر شمار	اسمائے گرامی	درجہ	سکونت	عہدہ
۱	طلحہ نذیر	تدریب افتاء	کولگام	صدر
۲	شمشاد احمد خان	اختصاص فی علوم الفقہ	کپواڑہ	نائب اول
۳	جہانگیر فیاض	عالیہ رابعہ شریعہ	سوپور	نائب دوم
۴	وسیم یوسف	عالیہ ثانیہ شریعہ	چرار شریف	معتمد مالیات
۵	عابر عباس	عالیہ ثانیہ شریعہ	بھلیسہ	رکن
۶	عتیق الرحمن	عالیہ ثالثہ شریعہ	پونچھ	رکن
۷	عمر جان نائک	عالیہ ثالثہ شریعہ	ڈوڈہ	رکن
۸	مشتاق احمد	عالیہ رابعہ شریعہ	چاڈورہ	رکن
۹	عمر رشید	عالیہ ثالثہ شریعہ	کرناہ	رکن
۱۰	عزیز الرحمن	عالیہ ثالثہ شریعہ	راجوری	رکن
۱۱	مدثر بشیر	عالیہ رابعہ شریعہ	سوپور	رکن
۱۲	مصدق سعید	عالیہ ثالثہ شریعہ	کپواڑہ	رکن
۱۳	حامد مقبول	خصوصی ثالث	اننت ناگ	رکن
۱۴	محمد حسان میر	خصوصی ثانی	پونچھ	رکن

۱۵	عمر یوسف	عالیہ ثالثہ شریعہ	ہندوارہ	رکن
۱۶	شیخ محمد کامران	عالیہ ثالثہ شریعہ	کپواڑہ	رکن
۱۷	ذوالقرنین	عالیہ رابعہ شریعہ	ڈوڈہ	رکن
۱۸	اسحاق احمد	عالیہ رابعہ شریعہ	ڈوڈہ	رکن
۱۹	عابد بابا	عالیہ ثالثہ شریعہ	سوپور	رکن
۲۰	محمد عمران وانی	عالیہ ثالثہ شریعہ	ڈوڈہ	رکن
۲۱	ذاکر حسین بٹ	تکمیل شریعہ	کولگام	رکن
۲۲	مدثر آخون	عالیہ ثالثہ شریعہ	کپواڑہ	رکن

امسال ۱۴۴۷ھ (۲۰۲۵-۲۶ء) فارغ ہونے والے سندی درجات کے طلبہ

نمبر شمار	اسمائے گرامی	سکونت	درجہ
۱	طلحہ نذیر ندوی	کولگام	تدریب افتاء
۲	شمشاد احمد خان	کپواڑہ	اختصاص فی علوم الفقہ
۳	ذاکر حسین بٹ	کولگام	تکمیل شریعہ
۴	ثاقب الاسلام ملک	کپواڑہ	تکمیل شریعہ
۵	ضیاء الحسن خان	کپواڑہ	تکمیل شریعہ
۶	فردوس محی الدین	کپواڑہ	تکمیل شریعہ
۷	انیس نبی میر	کپواڑہ	تکمیل شریعہ
۸	اسحاق احمد	ڈوڈہ	عالیہ رابعہ شریعہ (الف)
۹	جہانگیر فیاض	باہمولہ	عالیہ رابعہ شریعہ (الف)
۱۰	منیر احمد	بھلیسہ	عالیہ رابعہ شریعہ (الف)
۱۱	عبدالوحید پالہ	سوپور	عالیہ رابعہ شریعہ (الف)
۱۲	اویس احمد خان	کپواڑہ	عالیہ رابعہ شریعہ (الف)
۱۳	عادل رمضان	سوپور	عالیہ رابعہ شریعہ (ب)
۱۴	محمد عنایت اللہ خان	سرینگر	عالیہ رابعہ شریعہ (ج)

۱۵	رضوان اللہ	ڈوڈہ	عالیہ رابعہ شریعہ (ج)
۱۶	رضوان منظور	کپواڑہ	عالیہ رابعہ شریعہ (د)
۱۷	مبارک احمد خان	گاندربل	عالیہ رابعہ شریعہ (د)
۱۸	محمد زاہد	کٹھوعہ	عالیہ رابعہ شریعہ (د)
۱۹	طلحہ صدیق پیر	کپواڑہ	عالیہ رابعہ شریعہ (د)
۲۰	محمد انیس الرحمن	سرینگر	عالیہ رابعہ شریعہ (ہ)
۲۱	مدثر بشیر	سوپور	عالیہ رابعہ شریعہ (ہ)
۲۲	عادل احمد	کرناہ	عالیہ رابعہ شریعہ (ہ)
۲۳	عمران احمد تانترے	چاڈورہ	عالیہ رابعہ شریعہ (ہ)
۲۴	ابرارالاسلام	سوپور	عالیہ رابعہ شریعہ (و)
۲۵	فیصل ریاض	چاڈورہ	عالیہ رابعہ شریعہ (و)
۲۶	یاسر احمد	ڈوڈہ	عالیہ رابعہ شریعہ (و)
۲۷	راشد رفیق	کرناہ	عالیہ رابعہ شریعہ (و)
۲۸	ظہور عباس	ڈوڈہ	عالیہ رابعہ شریعہ (و)
۲۹	مشتاق احمد ڈار	چاڈورہ	عالیہ رابعہ شریعہ (ز)
۳۰	ذوالقرنین	ڈوڈہ	عالیہ رابعہ شریعہ (ز)
۳۱	منصور احمد بٹ	ڈوڈہ	عالیہ رابعہ شریعہ (ز)
۳۲	محمد ہارون آوان	کپواڑہ	عالیہ رابعہ شریعہ (ز)
۳۳	ہارون رشید	سوپور	عالیہ رابعہ شریعہ (ز)
۳۴	ظہور اسحاق لون	کپواڑہ	عالیہ رابعہ شریعہ (ز)
۳۵	عابد شبیر بٹ	سوپور	عالیہ رابعہ شریعہ (ح)
۳۶	داؤد الاسلام لون	لولاب	عالیہ رابعہ شریعہ (ح)
۳۷	ندیم علی شیخ	کپواڑہ	عالیہ رابعہ شریعہ (ح)
۳۸	شاہد منظور بھٹ	گاندربل	عالیہ رابعہ شریعہ (ح)
۳۹	مختار احمد کالس	پلوامہ	تکمیل ادب
۴۰	دلاور	اننت ناگ	تکمیل ادب